اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

خبرنامہ

ماہنامہ اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ

ستمبر ۲۰۲۳ء

اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد : ۵۲ ستمبر ۲۰۲۳ء شمارہ : ۳

سرپرست : **چیئرمین**

ایڈیٹر : **شوکت علی**

معاون : **محمد معاذ اختر احسن** (سپرنٹنڈنٹ)

زر سالانہ : پچاس روپے -/50

قیمت فی شمارہ : پانچ روپے -/5

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ،

گومتی نگر لکھنؤ-226010

فون نمبر:0522-4022924

شوکت علی، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۲
نعت شریف	رئیسؔ احمد نعمانی	۳
نعت شریف	نصیرؔ سراجی	۳
میر انیسؔ اور ہندوستانی تہذیب	ابراہیم اعظمی	۴
غزل	ظفر اقبال ظفرؔ	۱۰
غزل	جمیل احمد جمیلؔ	۱۰
ریڈیو ڈراما کا فن	ڈاکٹر اشرف لون	۱۱
غزل	فاروقؔ جائسی	۱۶
غزل	گہرؔ خیر آبادی	۱۶
پروفیسر ملک زادہ منظور احمد...	شعیب نظام	۱۷
غزل	فرقانؔ سردھنوی	۲۵
غزل	یٰسینؔ ابن عمر	۲۵
خالی خالی کرسیاں (افسانہ)	ندیم راعی	۲۶
غزل	مدہوشؔ بلگرامی	۲۸
ڈی پی (افسانہ)	ڈاکٹر زیبا ناز	۲۹
تبصرہ	مبصر	۳۱
انتظار حسین کی افسانہ نگاری (مصنف ڈاکٹر ابرار احمد)	محمد خبیب	۳۱

●●●

اداریہ

اردو صحافت بالخصوص اردو کی ادبی صحافت نے گذشتہ ۲۰۰ برس میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں، اس کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مختلف تحریکات میں اس نے اپنا اہم رول ادا کیا ہے۔ ملک کی جنگ آزادی کی تحریک میں اردو صحافت نے کلیدی کردار نبھایا۔ یوں بھی اخبارات ورسائل زندگی اور سماج کے مختلف مسائل کو اجاگر کرنے اور ایک بہترین سماج کی تشکیل میں اپنا خصوصی رول نبھاتے ہیں۔ بین الاقوامی خبروں کے ساتھ ہی ملک وسماج کے نشیب وفراز کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اخبارات ورسائل اپنے مشن اور ادارے کی بھرپور ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

اتر پردیش اردو اکادمی اپنے ابتدائی دور سے اردو زبان وادب کی بقا، ترقی وترویج کے لیے سرگرم عمل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'خبرنامہ' میں ریاست اتر پردیش ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے اہم قلم کاروں کی تخلیقات ونگارشات کی اشاعت کی جاتی ہے۔ بالخصوص نئے قلم کاروں کی تخلیقات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اردو داں حلقے میں 'خبرنامہ' نے آہستہ آہستہ اپنا ایک خاص مقام بنالیا ہے۔ اردو اکادمی تمام محبان اردو سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ماہنامہ 'خبرنامہ' کی اشاعت کو مزید مستحکم بنانے میں اردو دوستی کا ثبوت دیں۔ اپنے شہروں کے بک اسٹالوں پر اسے منگائیں تاکہ سالانہ خریداروں کے علاوہ عام قاری تک اس کی رسائی ہوسکے۔ 'خبرنامہ' کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے اپنے عہد کے قلم کاروں کی معیاری تخلیقات کو مناسب مقام دیا ہے۔ زندگی، سماج اور ادب کے عصری مسائل اور حالات کی عکاسی ان تخلیقات میں صاف نظر آتی ہے۔ تنقیدی مضامین کے علاوہ تخلیقی ادب کو خصوصیت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے تاکہ عام طلبا وطالبات اور ریسرچ اسکالرس کو اس بات کا احساس رہے کہ آج ادب میں کیا لکھا جارہا ہے اور ادب کی سمت ورفتار کیا ہے۔؟

اس لیے آیئے یہ عہد کریں کہ اردو اکادمی سے شائع ہونے والے رسائل کے سالانہ خریدار بنیں اور اپنے شہروں وقصبوں میں اس کی ایجنسی قائم کرائیں۔ قارئین کا یہ عزم وحوصلہ اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی قارئین 'خبرنامہ' میں شائع مضامین وتخلیقات سے متعلق اپنی رائے اور مشوروں سے بھی آگاہ فرمائیں تاکہ ان مشوروں پر غور وخوض کرنے کے بعد رسالہ کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔

'خبرنامہ' میں اس بات کا بھی التزام برتا جاتا رہا ہے کہ جس ماہ کا شمارہ ہوتا ہے اس مہینے کی اہم تاریخوں سے متعلق بھی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں۔ ستمبر ماہ میں عربی مہینہ ربیع اول کی اہم تاریخ بھی رہی۔ ربیع اول کا مہینہ مسلمانوں کے لیے خصوصی عقیدت واحترام کا مستحق ہے۔ اس لیے کہ اس ماہ میں محسن انسانیت سرور دو عالمؐ کی ولادت باسعادت بھی ہے جن کے نور سے کائنات روشن ہوئی۔ اردو اکادمی اپنے 'خبرنامہ' کے قارئین کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتی ہے۔

شوکت علی

ایڈیٹر

رئیس احمد نعمانی
جمال پور، علی گڑھ-Mob.9897820777

نعت شریف

جب جہاں میں چمن آرائے مدینہ آیا
باغِ ہستی میں بہاروں کا مہینہ آیا

سیکڑوں سال کے بہکے ہوئے انسانوں کو
آپؐ کے فیض سے جینے کا قرینہ آیا

اُن کے روضے پہ جو جاتے ہیں انھیں لگتا ہے
جیسے نزدیک ہی فردوس کا زینہ آیا

جب سے آقاؐ کی غلامی کی ملی ہے نسبت
میرے حصے میں بھی رحمت کا قرینہ آیا

چمک اٹھے گا بصات کا مقدر اپنی
سامنے آنکھوں کے جس روز مدینہ آیا

المدد! بحر حوادث کے بھنور میں یارب!
تیرے محبوب کی اُمت کا سفینہ آیا

سرکشی جس نے کی آقاؐ کی اطاعت سے رئیسؔ
مَرنا آیا اُسے دنیا میں، نہ جینا آیا

●●●

نصیرؔ سراجی
کچی باغ، وارانسی-Mob.8400067944

نعت شریف

نہیں ہے اب دلِ مضطر کو تابِ ضبط حضور
نظر کا گنبد خضر سے اب ہو ربط حضور

نہ مجھ سے سوءِ ادب کا ہو ارتکاب کبھی
کبھی نہ ہوں مرے اعمالِ خیر حبط حضور

اساسِ عالم کون و مکاں ہے آپ کا اسم
اسی سے سارے جہاں کا ہے نظم و ضبط حضور

وہ جس کو رائی برابر بھی بغض آپ سے ہو
ہمارا اس سے نہ ہو کوئی ربط ضبط حضور

دورد و کلمہ میں پڑھتا رہوں بہ ہوش و خرد
بوقت نزع مری عقل ہو نہ خبط حضور

کسی پہ ظلم کا پشتارہ پشت پر نہ رہے
جزا کے دن نہ مری نیکیاں ہوں ضبط حضور

نبی کو چھوڑ کے رب کو نہ پا سکو گے نصیرؔ
میانِ وحدت و کثرت ہیں وجہِ ربط حضور

●●●

ابراہیم اعظمی
گڑمبا کرسی روڈ،لکھنؤ-Mob.9611954067

میر انیس اور ہندوستانی تہذیب: تنقیدی تجزیہ

مرثیہ کی جائے پیدائش دکن کو شمار کیا جاتا ہے۔ دکن کے شعراء نے اس صنف میں خاص توجہ دی۔ ابتدائی ایام میں مرثیہ علاقہ دکن کے کچھ خاص خطوں میں لکھا اور پڑھا جاتا تھا۔ سرزمین بیجاپور اور قطب شاہی سلطنت کے خطہ گولگنڈہ میں اس صنف کو سراہا گیا۔ لیکن اس صنف شاعری کو بالخصوص شمالی ہندوستان میں فروغ حاصل ہوا ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق اس میدان میں میر تقی میرؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ نے مل کے اسے جلا بخشی اور اسے اتنی تقویت حاصل ہوئی کہ غزل اور قصیدے کو وہ مقام نہیں ملا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ دکن نے اس صنف شاعری کی بنیاد ڈال کر چھوڑ دیا تو شمالی ہند میں لکھنؤ کا علاقہ اس کی آماجگاہ بنا۔

رثائی ادب کے حوالے سے لکھنؤ کی جو شناخت ہے وہ ناقابل فراموش ہے، ابتدائی مراحل میں شعراء کی مختصر تعداد ہونے کے باوجود اس صنف سخن کو بلند مقام عطا کیا۔ اردو دنیا میں ادبی شاعری کے حوالے سے اس کی ترقی وترویج کی اگر بات کی جائے تو اردو مرثیہ نے بری اہم خدمات انجام دی ہیں۔

مرثیہ نے اردو میں جو رنگ اختیار کیا اوہ اردو شاعری میں جدت قرار پایا۔ دیگر ہندوستانی زبانوں میں ایسی کوئی صنف موجود نہیں ہے۔ بعد کے زمانے میں دہلی اور لکھنؤ کے علاقوں میں اردو شاعری کو جو تقویت ملی وہ ہندوستان کے کسی اور علاقہ میں نہیں ملی۔ ابتداء میں قصیدہ نے اپنا مسکن دہلی کو بنایا تو، مرثیہ نے لکھنؤ کو اپنا گہوارہ بنالیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، غالبؔ، چکبست، میرؔ ضمیر، میر خلیقؔ، میر حسنؔ، میر انیسؔ، میر زادبیرؔ اور میر مستحسنؔ وغیرہ نے اس صنف سخن کو ابتداء سے ارتقائی منزل تک پہنچایا۔

مرثیہ کے حوالے سے کم وبیش ہر عہد کی تہذیب وثقافت اور معاشرت کا مطالعہ بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہر عہد کے مرثیوں میں ادبی، معنوی، فکری، اور فنی نقوش واضح طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اردو مرثیے نے ہمیشہ زبان وادب میں نئے نئے اسالیب اور انسانی زندگی کو تحرک وتجسس کا جذبہ عطا کیا ہے۔ شعر وادب میں ایسے واقعات زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ جو انسان کی اجتماعی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ واقعات کربلا جو محض تخیلی داستان نہیں بلکہ اس واقعہ میں اعلیٰ انسانی اقدار ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی واقعات کی بہ نسبت واقعۂ کربلا نے

انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔

اس سلسلے کی ایک کڑی میر انیسؔ ہیں۔ میر انیسؔ میر خلیقؔ کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے تھے۔ مرثیہ نگاری ہی نہیں بلکہ اردو شاعری انھیں وراثت میں ملی تھی۔ انیسؔ نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ لیکن خاندانی وراثت میں ملی شاعری نے انیسؔ کو بہت جلد مرثیے کی طرف راغب کر دیا۔ چونکہ مرثیہ لکھنا اور پڑھنا انیسؔ کے خاندان کا آبائی مشغلہ تھا جو آگے چل کر میر انیسؔ کے لئے اصل فن ٹھہرا۔ میر انیسؔ مرثیہ لکھنے اور مرثیہ پڑھنے میں ماہر تھے۔ لکھنؤ میں مرثیہ کے حوالے سے جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں بلند خیالی کے ساتھ ساتھ انداز بیان کی بلند پروازی کی بدولت بہت جلد عوام میں مقبول ہو گئے۔

میر انیسؔ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی قادر الکلامی ہے۔ ان کے مرثیوں میں مختلف قسم کے مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جن سے نازک سے نازک کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس جذبے اور کیفیت کو اتنے خوبصورت اسلوب میں ادا کرتے ہیں کہ اس سے بہتر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج بھی ہمارے لبوں پر اردو مرثیے کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں خدائے سخن میر انیس کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مرثیہ اور میر انیس آپس میں لازم و ملزوم ہیں جنھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایک کے بغیر دوسرے کو صحیح معنوں میں سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے مرثیوں میں وزن، قافیہ، ردیف کی قیدوں کو اس طرح قائم کرتے ہیں کہ شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

میر انیسؔ اپنی قادرالکلامی سے اسے اتنا آسان کر دیتے ہیں کہ ان میں فطری بے ساختگی اور حسن ترتیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں شاعری کے لوازمات اور متعلقات سے لے کر محاسن و کمالات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ انیسؔ کے مرثیوں میں واقعہ، بیانیہ، پیکر تراشی، منظر کشی اور فصاحت و بلاغت کے اوقاف و رموز کے ساتھ ساتھ آئینہ فطرت، جمالیاتی حسن اور معنویت کے عناصر جا بجا نظر آتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات میں ان کو مہارت حاصل ہے اس لئے کہ جتنی نازک اور لطیف تشبیہیں ان کے مرثیوں میں ملتی ہیں کسی اور اردو شاعر کے کلام میں نہیں ملتی ہیں۔ مرکب تشبیہوں کے استعمال کی وجہ سے ان کے مرثیے خصوصیت کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں ؎

رن ہوا، جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے
اے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے

انیسؔ نے مرثیوں میں موضوع اور نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے حسب ضرورت ایسی فضا تیار کی ہے جس کو پڑھتے ہوئے فوراً ذہن اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

منظر نگاری شاعری کا وہ خاص حصہ ہے جو انسانی

ذہن ودل پرسب سے پہلے اثر چھوڑتا ہے۔ جو قاری یا سامع کو بہت دیر تک اپنے حصار میں قید رکھتا ہے۔ انیسؔ اپنے مرثیوں میں صبح، دوپہر، شام، سردی، گرمی، بہار، آندھی، طوفان، صحرا، گرودغبار وغیرہ جیسے مناظر کو بے حد لطیف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بند دیکھیں ؎

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

درحقیقت مرثیہ کا تعلق ایسے تاریخی واقعہ سے تھا جس کی وجہ سے اس میں مختلف مضامین کی گنجائش نکل آئی۔ اس میں جن مضامین کو پیش کیا گیا، ان میں منظر نگاری، واقعہ نگاری، رزمیہ نگاری، جذبات نگاری، سیرت نگاری اور مذہب واخلاق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

انیسؔ کے مرثیوں میں ان مضامین کو بہت خصوصی اہمیت حاصل ہے جن میں انداز بیان، فصاحت و بلاغت کا ایک بلند معیار ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ لیکن ان کے فن کی عظمت اس کے معنوی پہلو سے ہوتی ہے بقول علامہ شبلی:

''میر انیس کے کلام میں الفاظ کی بلاغت اگرچہ کہ انتہائی درجہ کی ہے۔ لیکن ان کے کمال کا اصلی معیار نہیں ہے، ان کے کمال اصلی جوہر تو معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے''

(موازنہ انیس ودبیر۔ شبلی نعمانی۔ ص ۹۲)

میر انیس نے اپنے مرثیوں میں جو فطری مناظر کی تصویر کھینچی ہے اس میں خاص جگہ کا خیال نہیں رکھا ہے، بلکہ ان کا میلان مثالیت پسندی کی طرف ہے۔ چنانچہ ان کے مرثیوں میں کہیں کہیں مناظر فطرت کا خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

مرثیہ کے حوالے سے پروفیسر عباس رضا نیر ایک جگہ پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''کم وبیش ہر عہد کے تہذیب وتمدن اور معاشرت کا مطالعہ بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ صنف مرثیہ کو کسی خاص طبقہ سے منسوب یا مخصوص کرنا یا صرف مذہبی گردانا قطعاً انصاف کے منافی ہے۔ مرثیہ نے ہر زمانے میں اپنی ادبی معنوی فنی وفکری نقوش واضح طور پر چھوڑے ہیں، اردو مرثیہ نے زبان وادب میں نئے نئے اسالیب اور انسانی زندگی کو متحرک اور تجسس کا جذبہ عطا کیا ہے''

(کلام انیس میں ہندوستانی تہذیب وثقافت۔ مشمولہ مضمون ادبی نشیمن شمارہ جون ۲۰۲۳)

اس اقتباس کے پیش نظر اگر ہم مرثیہ کے خدوخال کی بات کرتے ہیں تو اس ضمن میں میر انیسؔ نے دو قسم کے مرثیے لکھے ہیں۔ ایک رزمیہ اور دوسرا بزمیہ واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ رزمیہ مرثیہ میں اس علاقے کی تہذیبی عناصر کو بھی پیش کیا جاتا ہے جنگ کا میدان اور کربلا کے واقعات کے ساتھ ساتھ اس شہر اور علاقے کی جو زبان رائج تھی اس کے بنیادی عناصر بھی میر انیسؔ اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔

اردو مرثیے میں تہذیب کے حوالے سے اگر ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مرثیہ کے ارتقاء میں داخل تہذیب وتمدن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دکن، دہلی اور لکھنؤ یہ تین علاقے اپنی تہذیب کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ومعروف ہیں۔اردو ادب میں یہی وہ علاقے ہیں جن میں اپنی تہذیب وثقافت سے لبریز ادبی ذخیرے چھوڑے ہیں۔دکن کا علاقہ اس کا بڑا کینوس ہے گولکنڈہ، بیجا پور، اور بیدر اس کا پورا سلسلہ ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی تک ملتا ہے۔اس کے بعد دہلی میں اردو جوان ہوتی ہے لیکن لکھنؤ میں اس کی نوک پلک سنواری جاتی ہے۔اس تہذیب کا اگر عملی ثبوت ملتا ہے تو وہ لکھنؤ کا علاقہ ہے اور لکھنؤ کا لسانی معاشرہ اس کی نمائندگی کرتا ہے۔

ہر زبان کا اپنا لسانی معاشرہ بھی ہوتا ہے۔جو زبان جہاں کی ہے وہیں کے محاوروں کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ان کی ترکیبوں کے ساتھ بولی جائے گی۔اور میر انیسؔ وہی زبان فیض آباد سے لکھنو لے آتے ہیں تو لکھنؤ والے چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور کہتے ہیں اجازت دیں یہ لکھنؤ کی زبان نہیں ہے، یہ میر انیسؔ کے گھر کی زبان ہے۔عباس رضا نیر ایک دوسری جگہ پر لکھتے ہیں:

> ''لکھنؤ میں میر انیسؔ اپنے بیٹے میر نفیس سے کہتے ہیں: صاحب زادے اہل لکھنؤ ایسے نہیں بولا کرتے، یہ جو تہذیب ہے یہ ماؤں اور بہنوں سے بنتی ہے۔یہ کربلا کی جو تہذیب ہے جس کو پیش کرنے کا کام ماؤں او بہنوں کی تربیت کے ذریعہ اگلی نسلوں سے کیسے منتقل کرتی ہے۔''

(کلام انیس میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت
مشمولہ مضمون ادبی نشیمن، شمارہ جوں ۲۰۲۳)

جس تربیت کی ہم بات کررہے ہیں وہ مرد سے زیادہ خواتین کرداروں کے ذریعہ واقعات کربلا میں سامنے آتی ہے، اور جو بیگماتی زبان اودھی زبان سے تشکیل پاتی ہے اور وہی زبان میر انیسؔ کی زبان ہے۔جناب زینب کی جو لفظیات ہیں اس پر میر انیسؔ نے ڈکشن کو پوری طرح سے سجا سنوار کر پیش کیا ہے جو ہماری بیگماتی زبان کہلائی، حضرت زینب حضرت علی اکبر کے لاشے پر کس طرح سے بین کرتی ہیں ؎

ہے ہے نہ تیرا بیاہ رچانا ہوا نصیب
ہے ہے دلہن نہ بیاہ کے لانا ہوا نصیب
پوتے کو گود میں نہ کھلانا ہوا نصیب
شادی کے بدلے خاک اڑانا ہوا نصیب
ندی لہو کی چاند سی چھاتی سے بہہ گئی
بہنوں کی نیگ لینے کی حسرت ہی رہ گئی

میر انیسؔ نے ہندوستانی روایتوں میں پوتے کو گود میں کھلانے کی بات اور بہنوں کو نیگ لینے کی بات کو کتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؎

ہنس ہنس کے اب یہ ماں کسے دولہا بنائے گی
واری جواب دو کہ دولہن کس کی آئے گی
اب سالی کس کے ہاتھ میں مہندی لگائے گی
ماں بیاہنے کو دھوم سے اب کس کو جائے گی
بستی مری اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا
بیٹھوں کہاں پہ گھر تو عزا خانہ ہو گیا

ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں لفظی جزئیات کا استعمال بڑے منفرد انداز میں کیا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے کربلا کے واقعات میں رونما ہوئے تمام چھوٹے بڑے حادثات کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیں۔

یوں بر چھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہو گرد آفتاب کے
تن تن کے رکھے کاندھوں پہ بچوں نے جو بھالے
ماں تکتی تھی ہاتھوں سے کلیجہ کو سنبھالے
رن سے جو فوجیں بھاگی ہیں منہ پھیر پھیر کے
ہاتھی بھی مار ڈالا ہے بچوں نے چیر کے

میر انیسؔ کے مرثیوں میں واقعات تسلسل کے ساتھ ملتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انیسؔ کے مرثیوں میں داستان نگاری کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔داستان نگاری کو صنف مثنوی کے لئے سب سے موزوں سمجھا گیا ہے اور انیس نے اس صنف کو اپنے مرثیانہ انداز میں منظّم طریقہ سے پیش کیا ہے۔انہوں نے اکثر تاریخی واقعات کو روایتی واقعات سے جوڑ کر اپنا موضوع تیار کیا ہے۔

منظر نگاری ،واقعہ نگاری ،اور رزمیہ نگاری کا تعلق مادی اشیاء سے ہے اس میدان میں میر انیسؔ نے جو بلاغت صرف کی اس سے کائنات اور انسانی زندگی کے خارجی پہلوؤں کا گہرا مطالعہ اور نکتہ شناسی پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔خارجی مظاہر کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر دینا آسان کام نہیں ہے لیکن زندگی کے داخلی پہلوؤں کی عکاسی اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔اس کے لئے شاعر کو مشاہدہ و مطالعہ کی ایک نئی دنیا یعنی جذبات و احساسات کی دنیا میں قدم رکھنا پڑتا ہے اور میر انیسؔ فطرت انسانی کے ایک بہت بڑے راز دار ہیں۔وہ خوب جانتے ہیں کہ کس موقع پر کس قسم کے جذبات کس درجہ تک آدمی کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔میر انیسؔ نے عام طور پر اقتضائے حال ،حفظ مراتب اور جذبات کے درجات و تناسب اور ربط و تسلسل کا ایسا خیال رکھا ہے کہ جذبات نگاری میں ان مرثیوں کا پایہ بہت بلند ہو گیا۔

میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں استعارہ اور علامتیں اس قدر استعمال کی ہیں جس طرح سے اردو غزل میں تشبیہات و استعارات مستعمل ہیں۔یہ وہ تشبیہات و استعارات ہیں اس سے قبل اردو مرثیہ میں کسی نے استعمال نہیں کئے ہیں۔میر انیسؔ اردو زبان و ادب اور اردو مرثیے کی مناسبت سے وہ اہم نام ہے جسے ہندستانی تہذیب کا عظیم ستون تسلیم کیا گیا ہے۔یہ اشعار دیکھیں۔

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم
مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں ابر زیادہ تھا اور نہ کم

میر انیسؔ کے مرثیوں میں کردار نگاری کا کمال بھی موجود ہے،انہوں نے ممتاز شہسوار کربلا کے کرداروں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔کردار نگاری میں میر انیسؔ نے شکل و صورت اور وضع قطع کے بیان سے لے کر ان کے گفتگو کا طریقہ وغیرہ بہت مناسب انداز میں بیان کیا ہے۔ان کے مرثیوں میں

اخلاق کا درس بھی موجود ہے۔ چونکہ میر انیس نے اپنے مرثیوں میں اخلاقی عظمت کو بہت کامیابی کے ساتھ سمونے کی کوشش کی ہے اس معاملے میں وہ ایک بہتر فنکار کی طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں ۔انہوں نے شہدائے کربلا کی کردار نگاری جس انداز میں کی ہے وہ ان کی حقیقی عظمت سے زیادہ قریب ہے۔ ان کے مرثیوں کا مطالعہ کرنے سے ہمارے اندر اسلامیات کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔اسی لئے محمد علی جوہر نے کہا تھا کہ ؎

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے کے بعد

انیسؔ کے مرثیوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مرثیہ کو ڈرامائی انداز میں لکھا ہے۔جس طرح سے داستان ناول افسانہ میں ڈرامہ ہوتا ہے اسی طرح مرثیہ میں بھی ہوتا ہے۔اس کے لئے کردار نگاری اور جذبات نگاری کا سہارا لینا پڑتا ہے اور میر انیس کے مرثیوں میں یہ عناصر کثرت سے ملتے ہیں۔انہوں نے واقعات اور انسانی افعال کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ اس میں ڈرامائی شان نظر آتی ہے۔

انیسؔ کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے جتنا فصیح ہے معنی کے اعتبار سے اتنا ہی بلیغ نظر آتا ہے۔اور یہ کیفیت شاعری کے اصولوں کے بالکل قریب نظر آتی ہے بقول علامہ شبلی نعمانی:

''بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو۔دونوں لازم وملزوم ہیں، جو کلام فصیح نہیں ہوگا وہ بلیغ بھی نہیں ہوگا ۔انیسؔ کے کلام میں فصاحت و بلاغت کا ایک ناقابل تحلیل امتزاج ملتا ہے۔''

(موازنہ انیس ودبیر۔شبلی نعمانی)

روئے ہیں فرقت شہ عالی جناب میں
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں
چھپ جائے جس سے دور کا ناطہ ہے صاحبو
دولہا دولہن کو لینے کو آتا ہے صاحبو
اولاد بھی پیاری ہے تو حضرت ہی کے دم تک
کہئے کہ بلائیں بھی نہ لوں سر سے قدم تک

میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں شاعری کے اسرار ورموز کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدن کو بیان کیا ہے،اور کربلا کے واقعات کو استعارے کے طور پر استعمال کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے ۔انسانی شعور میں آج بھی انیسؔ کے مشاہدے کی باریک بینی غالب ہے۔یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ میر انیسؔ جیسا شاعر اس کے دامن میں موجود ہے جو زبان وادب کے ہر محاذ پر ادب کی رہنمائی کرتا رہے گا۔اس لئے کہ انہوں نے اپنے فنی کمالات کے جو جوہر دکھائے ہیں وہ کسی اور مرثیہ نگار کے دامن میں نہیں ہیں۔اگر چہ کہ بعد کے زمانے میں انھیں رجحان پسند کہا جانے لگا۔لیکن جب بھی اردو مرثیہ کی بات آتی ہے تو اس میں سب سے پہلا نام میر انیسؔ کا لیا جاتا ہے۔

حوالے۔

۱۔ موازنہ انیس ودبیر۔علامہ شبلی نعمانی
۲۔ کلام انیس میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت ۔مشمولہ مضمون ادبی نشیمن،شمارہ جون ۲۰۲۳
۳۔ لکھنؤ کے شعروادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر۔از ڈاکٹر سید عبدالباری
۴۔ غالب کے عہد میں لکھنؤ کے اشاعتی ادارے۔از ڈاکٹر عمیر منظر
۵۔ رسالہ قومی زبان۔انیس نمبر شمارہ ۲۰۱۸ء

❑❑❑

ظفر اقبال ظفؔر
خیلدار، فتح پور-Mob.8756433896

غزل

تیری تصویر خریدار کی محتاج نہیں
یہ کسی رونق بازار کی محتاج نہیں

اوڑھ کر اپنا بدن خاک میں سو جاتا ہوں
نیند میری در و دیوار کی محتاج نہیں

میرے اشعار میں خوشبو ہے مرے زخموں کی
یہ کسی کے لب و رخسار کی محتاج نہیں

زندگی ہوتی ہے اخلاص عمل سے روشن
یہ خریدے ہوئے کردار کی محتاج نہیں

فن کی قیمت تو ستائش سے ادا ہوتی ہے
یہ زر و درہم و دینار کی محتاج نہیں

سر پہ ہے میرے بزرگوں کی دعا کا سایہ
زندگی سایۂ اشجار کی محتاج نہیں

میرے پیروں میں تو کانٹے ہیں مسائل کے ظفؔر
ایڑیاں میری کسی خار کی محتاج نہیں

●●●

جمیل احمد جمیلؔ
اشرف آباد، لکھنؤ-Mob.9415780888

غزل

اے چشم سحر ساز بتا کوئی کاٹ ہے
کچھ آج صبح سے ہی طبیعت اُچاٹ ہے

پوچھے گا کون حال فقیرانِ عشق کا
سر پر ہے سائباں نہ کوئی ٹوٹی کھاٹ ہے

زخمی ہے کس قدر مرے اندر کا آدمی
سمجھے گا کون جب مرا چہرہ سپاٹ ہے

بازار تک گئی نہیں اس گھر کی آبرو
پردے کے نام پر جہاں بوسیدہ ٹاٹ ہے

تعمیر کر رہے ہو محل اور حویلیاں
دو گز زمین کا بھی کہیں پر پلاٹ ہے؟

ہے مفلسی کنیز تو فاقے غلام ہیں
ہم خانماں خرابوں کا یہ راج پاٹ ہے

غم آئے، درد آئے، فریب آئے، بے دریغ
ہر وقت وا جمیلؔ کے در کا کپاٹ ہے

●●●

ڈاکٹر اشرف لون
سوپور، جموں وکشمیر-Mob.9811112564

ریڈیو ڈراما کا فن

ڈراما کی مختلف قسمیں ہیں، مثلاً اسٹیج ڈراما، ریڈیو ڈراما، ٹیلی ویژن ڈراما، ادبی ڈراما وغیرہ۔ ڈراما کی ان اقسام کے اپنے اپنے اور مختلف تقاضے ہوتے ہیں جن سے ان ڈراموں کی ایک انفرادیت جھلکتی ہے۔ ڈراما کی ان اقسام میں ادبی ڈراما کے بعد موجودہ دور میں ریڈیو ڈرامے نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ریڈیو ڈراما ریڈیو اسٹیشن کے ایک چھوٹے سے کمرے میں تیار کیا جاسکتا ہے یا کیا جاتا ہے, جہاں چند افراد کے علاوہ کچھ مشینوں اور مائکروفون وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جان ڈالمین نے کسی بھی فن کے لیے مندرجہ ذیل سات صفات کو ضروری قرار دیا ہے:

۱۔ وحدت مقصد و تاثر یعنی کہانی کی ابتدا سے لے کر ایک ہی تاثر قائم رہے اور کہانی ایک ہی مقصد کو ذہن میں لکھ کر لکھی گئی ہو اور ڈراما نگار اس ڈراما کے ذریعے ایک مخصوص نقطۂ نظر پیش کرے۔

۲۔ زور یعنی اہم ترین عناصر کا امتیاز یا اہم بات کی غیر اہم باتوں سے علیحدگی۔

۳۔ لَے یعنی روانی کا دلچسپ آہنگ۔

۴۔ توازن یعنی آرائش وتزئین کا آہنگ۔

۵۔ تناسب یعنی مقصد اور اظہار، اجمال وتفصیل، کہانی اور پلاٹ کا فنی طور پر ہم وزن ہونا۔

۶۔ تطابق یعنی تخلیق کے مختلف مدارج کا ہم آہنگ ہونا۔

۷۔ فطری سادگی اور سہولت یعنی اظہار وابلاغ اور تفہیم وپسندیدگی میں آسانی۔!

عمیق حنفی کے مطابق ریڈیو ڈراما میں یہ تمام عناصر ہوتے ہیں اور ایک کامیاب ڈراما میں ان عناصر کا ہونا ضروری مانا جاتا ہے۔ ریڈیو ڈراما میں ان عناصر کے ہونے سے ڈرامے کے کامیابی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کو ریڈیو ڈراما کے اجزائے ترکیبی بھی کہہ سکتے ہیں۔

ڈراما کی مختلف اقسام کی طرح ریڈیو ڈراما کو بھی اب باقاعدہ ایک فن کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ڈراما نگار مائکروفون کی اہمیت اور اس کی صلاحیت سے واقفیت رکھتا ہو۔ ایک ریڈیو ڈراما نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ نشری اسٹوڈیو کی خصوصیات کو ذہن میں رکھ کر ڈراما تخلیق کرے۔ اس ضمن میں حسن مثنیٰ فرماتے ہیں:

> ''فنی نقطۂ نظر سے، تکنیکی نقطۂ نظر سے اور پیش کش کے نقطۂ نظر سے بھی یہاں ریڈیو کی لہریں اہمیت رکھتی

ہیں، آوازیں اہمیت رکھتی ہیں اور پیش کش کا انداز اہمیت رکھتا ہے۔اس میں اہم سازوں اور آوازوں کے ذریعے مختلف قسم کا سماں باندھ دیتے ہیں۔مثلاً جھرنوں کی آواز، چڑیوں کی چہچہانے کی آواز۔۔۔۔۔آوازوں کے اس کھیل میں ہمارا ساتھ دیتا ہے مائکروفون جس کے ذریعہ ایک ڈراما آرٹسٹ اپنی ہر سانس اور اپنے اندر موجود فن کو ظاہر کرنے کا کام لیتا ہے یعنی یہاں بھی مائکروفون ایک دوست اور ہمدم جو آرٹسٹ کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھے رہتا ہے۔''[۲]

ریڈیو ڈراما میں زبان، مکالمے، موسیقی اور اصوات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان چیزوں کے کامیاب امتزاج سے ہی ایک اچھا اور کامیاب ریڈیو ڈراما وجود میں آتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ریڈیو ڈراما میں آواز کا اہم رول ہوتا ہے۔کوئی بھی منظر، صورت حال یا کسی دوسری چیز جیسے خوف، دہشت، محبت، نفرت وغیرہ کی تصویر مکالمے اور مخصوص صوتی اثرات کے ذریعہ سامعین کے دماغ میں مرتب کی جاتی ہے۔ اور اس طرح سامعین پر ڈرامے کا تاثر ابتدا سے آخر تک قائم رہتا ہے۔اگر یہ نہ ہو تو سامع کی ڈراما میں دلچسپی جلد ہی ختم ہوسکتی ہے، جس کا مطلب ہے ڈراما اور ڈراما کی ناکامی۔

ریڈیو ڈراما سامعین کے دماغ میں کھیلا جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں اسٹیج سامع کا دماغ ہوتا ہے۔نہ صرف ایک ڈراما نگار کے لیے سامعین کے دماغ کو اسٹیج سمجھ کر ڈراما لکھتا ہے بلکہ سامعین ڈراما سنتے وقت اپنے تخیل سے اسٹیج ترتیب دیتے ہیں اور اس طرح جیسے جیسے ڈراما آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے سامعین کی دلچسپی بھی اس ڈرامے میں بڑھتی جاتی ہے۔اس میں تقریباً سب کام مکالمہ اور زبان کے ذریعے انجام دیے جاتے ہیں اور یہی چیز اسے اسٹیج ڈراما سے الگ کرتی ہے۔اور اسے مزید دلچسپ بھی بنا دیتی ہے۔

ریڈیو ڈراما کو سماعتی فن (Aural Art) کہتے ہیں کیونکہ اس میں صوت اور سماعت کا اہم رول ہے بلکہ یہ ڈراما لکھا ہی جاتا ہے سامعین کے ذہن کو مدنظر رکھ کر اور پھر مختلف و متعدد اصوات سے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔یہاں اسٹیج ڈراما کی طرح ناظرین کا کوئی عمل دخل نہیں۔ بقول ڈاکٹر اخلاق اثر:

''ڈراما نگار کی تحریر کو مخصوص معنی دینے کے لیے ہدایت کار، صداکار کا تعاون حاصل کرتا ہے اور سامع کا تخیل اس مخصوص معنی سے ہٹ کر کچھ اور نہیں سوچتا۔ صداکار کی آواز الفاظ کو حرکت اور زندگی دے کر سامع کے تخیل کو اسیر کر لیتی ہے۔مکالموں کی ادائیگی میں شگفتگی، شیرینی، لگاوٹ اور لچک، دکھ اور درد، کسک و کراہ، تذبذب، ٹھہراؤ اور خاموشی سامعین کو مقررہ راہوں پر گامزن رکھتی ہیں اور کبھی کبھی ایک کراہ، خاموشی اور تذبذب سے ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بہت سی تصویروں اور تحریروں سے پیدا نہیں کی جاسکتی۔الفاظ کا طلسم، آواز کا سحر، تخیل کی بیداری سے صوتی تصویریں عام تصویروں سے زیادہ فکر انگیز ہوتی ہیں۔''[۳]

اگر چہ ریڈیو ڈراما صرف آواز کا میڈیم ہے مگر اسے کئی معنوں میں اسٹیج اور ٹیلی ویژن ڈراما پر فوقیت حاصل ہے۔سب سے بڑی خصوصیت اس کی داخلیت اور تخلیت ہے۔ریڈیو ڈراما میں بہت سی جگہوں پر تخیل سے کام لینا پڑتا ہے اور بہت سی چیزیں بیان کرنی ہوتی ہیں۔بقول زبیر شاداب ''ریڈیو ڈراما بہت آسانی سے کرداروں کی ذہنی دنیا میں اتر کر اس کشمکش سے واقعاتی ترتیب عمل میں لاتا ہے۔''[۴]

اس ضمن میں سدھ ناتھ کمار مزید فرماتے ہیں:

> ''اسٹیج کی حدیں متعین ہیں اس میں سبھی موضوعات کو بروئے کار نہیں لایا جاسکتا ہے۔ریڈیو ڈراما، اسٹیج اور اس کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔اس میں چرند پرند بھی کردار بن سکتے ہیں، بے جان کو جاندار بنا کر پیش کیا جاسکتا ہے۔متحرک مناظر بھی اپنی صوت وصدا کے ساتھ نمودار ہوسکتے ہیں۔اس میں کسی بھی جگہ کسی بھی قسم کا منظر دکھایا جاسکتا ہے۔جنت اور جہنم، آسمان اور زمین، پہاڑ اور سمندر، ندی اور جھرنے، میدانِ رزم اور محفلِ بزم سبھی بڑی آسانی سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔''[۵]

سنیما اور تھیٹر میں بہت سی چیزیں جیسے اداکاروں کا لباس، حسن، شکل وصورت، زیبائش، اُن کی مختلف حرکتیں اور اشارے وغیرہ ہماری توجہ ڈراما کے بنیادی موضوع سے ہٹاسکتی یا ہٹاتی بھی ہیں۔ریڈیو ڈراما میں ایسا ہونے کے بہت کم امکانات ہیں یا نہ ہونے کے برابر ہیں کیونکہ یہ ان چیزوں سے عاری ہے۔یہاں ہماری توجہ ڈراما کے ہر لفظ اور ہر صوت پر بڑی مضبوطی سے جمی رہتی ہے اور ہم ڈراما کو بڑے غور سے سُن سکتے ہیں اور مکمل طور پر محظوظ بھی ہوسکتے ہیں۔

ریڈیو ڈراما میں آواز کو شکل وصورت اور لباس و زیبائش پر فوقیت حاصل ہے۔ ریڈیو ڈراما میں اسٹیج ڈراموں کی طرح آرائش و زیبائش، لباس، اداکاروں کی حرکات و سکنات، شکل وصورت وغیرہ اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ اس میں الفاظ کے بعد سب سے بڑی اہمیت آواز کی ہے۔جو کام اسٹیج ڈرامے میں اسٹیج انجام دیتا ہے جہاں ایک ہداہت کار یا ڈراما نگار مختلف مناظر پیش کرتا ہے وہی کام ریڈیو ڈرامے میں آواز انجام دیتی ہے۔اس کے ذریعہ سے بہت سے کام انجام دیے جاتے ہیں۔موسیقی اور مختلف آوازوں سے کسی بھیڑ بھاڑ کا منظر، ریل کا چلنا، چڑیوں کا چہچہانا اور اسی طرح دیگر مناظر کو سامع کے تخیل تک پہنچایا جاتا ہے۔یہ صوتی اثرات ماحول وفضا اور کرداروں کی شکل وصورت کی بصری تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ڈراما میں صوتی اثرات کی زیادتی نہ ہو بلکہ ان صوتی اثرات کو صحیح وقت پر پیش کیا جانا چاہیے۔ریڈیو ڈراما میں دوری یا نزدیکی کو مائکروفون سے دور یا نزدیک رہ کر یا مائکروفون کی آواز کو گھٹا یا بڑھا کر ظاہر کیا جاتا ہے۔اور یہ سب کچھ کمرے میں ایک جگہ بیٹھ کر انجام دیا جاتا ہے۔

ریڈیو ڈراما میں مکالمے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ چونکہ ریڈیو ڈراما میں تخیل سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے اور ہر چیز بیان کرنی ہوتی ہے اس لیے اس میں مکالمے کی اہمیت اسٹیج اور ٹیلی ویژن سے زیادہ ہوتی ہے۔اس میں کرداروں کی تعمیر، عمل و ردعمل، مختلف حرکات وسکنات، جذبات کا اظہار وغیرہ سب کچھ

مکالمے کے ذریعہ ہی بیان کیا جاتا ہے۔ یہ مکالمے جتنے فطری اور روزمرہ کی زبان میں ہوں اتنا ہی ریڈیو ڈراما کامیاب ہوگا۔ ریڈیو ڈراما کی کہانی بھی مکالموں کے ذریعے ہی آگے بڑھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مکالموں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ریڈیو ڈراما میں مکالمے مختصر ہونے چاہیے۔ مکالموں میں اثر پیدا کرنے کے لیے موسیقی کا بروقت اور مناسب استعمال ہو۔ چونکہ ریڈیو ڈراما میں تقریباً سب کام الفاظ اور آوازوں کے ذریعہ انجام دیے جاتے ہیں اس لیے کرداروں کی آواز پرکشش اور جاذب ہونی چاہیے تاکہ سامعین کو ڈراما سنتے وقت کسی قسم کی کراہیت یا اکتاہٹ نہ محسوس ہو۔

ریڈیو ڈراما میں ادبی زبان کے بجائے بولی اور سنی جانے والی زبان یا دوسرے الفاظ میں عوامی زبان و آسان زبان استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ ریڈیو کے سامعین میں ہر طرح کے لوگ ڈاکٹر، پروفیسر، ان پڑھ گنوار شامل ہوتے ہیں۔ یہاں آسان یا عوامی زبان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ڈراما نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کے مزاج سے واقف ہو اور ہر مکالمے کو کردار کے حسب حال لکھے۔ کرداروں کی لیے مکالمے لکھتے وقت کرداروں کی معاشرت، نفسیات، معاشی اور ذہنی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، تبھی ایک ڈراما نگار فطری مکالمے لکھ سکتا ہے۔ بقول زبیر شاداب ریڈیو ڈراما کے مکالموں میں Suggestive Power کا ہونا ضروری ہے تاکہ سامع کا تخیل بیدار ہو۔ ان میں اس قدر قوت ہو کہ وہ علامتی آواز ثابت ہوسکیں۔ تاکہ ان کی معنویت بوالعجبی کے نگار خانے تعمیر کرنے میں کامیاب ہوں اور ہر سامع انہیں سننے کے بعد الگ الگ نوعیت کے معنی ومناظر سے دوچار ہو۔[۶]

ریڈیو ڈراما لکھنے سے پہلے ڈراما نگار کے ذہن میں پلاٹ اور ہیئت کا خاکہ صاف ہونا چاہیے۔ اور اس کے بعد ہی اُسے دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ایک تو ٹارگیٹ سامعین Target Audience کی مناسبت کا خیال رکھا جانا چاہیے اور دوسرے یہ کہ تکنیکی طور پر اسے ریڈیو کے ذریعہ پیش کیا جاسکے گا یا نہیں۔ کسی منصوبے یا تجویز یا بنیادی خیال کو کہانی کی شکل کیسے دی جائے اس کا طریقہ پروفیسر محمد شاہد حسین نے یہ بتایا ہے:

۱۔ صورت حال کی وضاحت کردی جائے۔

۲۔ ابتدائی تصادم سے متعارف کرایا جائے۔

۳۔ کشمکش اور حرکت وعمل کے ذریعے نقطۂ عروج پیدا کرایا جائے۔

۴۔ مسئلے یا جھگڑے کو جس کی وجہ سے تصادم پیدا ہوا تھا سلجھا دیا جائے۔[۷]

اسٹیج ڈراما کی طرح ریڈیو ڈراما میں بھی پلاٹ ہوتا ہے، جس میں ابتداء، وسط، اختتام، حرکت وعمل، ارتقاء اور نقطۂ عروج بھی ہوتا ہے۔ اور پلاٹ کی ویسی ہی اہمیت یہاں بھی ہے جو اہمیت یہ اسٹیج ڈراما یا کسی افسانہ یا ناول میں رکھتا ہے۔ یہ پلاٹ نہ ہو تو کہانی بکھر جائے گی اور سامعین جلد ہی اس سے اُکتا جائیں گے۔ ریڈیو ڈراما میں زیادہ کرداروں کی

گنجائش نہیں ہوتی بلکہ اس میں میں کرداروں کی تعداد کم ہونی چاہیے تاکہ سامعین کے ذہن سے کردار غائب نہ ہو جائے۔ کرداروں کی شناخت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کی آوازیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں۔ ریڈیو ڈراما میں سامعین کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مدت مختصر ہو، کم سے کم آدھ گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ۔

حوالے:

۱۔ زبیر شاداب، ''ریڈیو نشریات: تاریخ اصناف اور پیشکش'' (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۸ء) ص ۱۰۸۔

۲۔ حسن مثنیٰ، ''ریڈیو نشریات: آغاز وارتقاء'' (نئی دہلی، ایلیا پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۲۰۲۔

۳۔ ڈاکٹر اخلاق اثر، ''ریڈیو ڈرامے کا فن'' (دہلی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۷ء) س ۹۴۔

۴۔ زبیر شاداب، ''ریڈیو نشریات: تاریخ اصناف اور پیشکش''، ص ۱۸۸۔

۵۔ سدھ ناتھ کمار، ''ہندی ایکانکی کی شلپ ودھی کا وکاس'' (دہلی، اندر پرستھ پرکاشن، ۱۹۷۸ء) ص ۳۵۳۔ بحوالہ زبیر شاداب، ''ریڈیو نشریات: تاریخ اصناف اور پیش کش''، ص ۱۸۸

۶۔ زبیر شاداب، ''ریڈیو نشریات: تاریخ اصناف اور پیش کش''، ص ۱۱۱-۱۱۲

۷۔ ڈاکٹر محمد شاہد حسین، ''ابلاغیات'' (دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء) ص ۲۳۷۔

❑❑❑

تخلیق کاروں سے گذارش

اپنی تخلیقات رنگارشات صفحہ کے ایک طرف ہی لکھیں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔

ای۔میل سے بھیجی ہوئی تخلیقات رنگارشات کی ہارڈ کاپی جس پر آپ کا پتہ اور موبائل نمبر صاف صاف درج ہو، بھیجنے کی زحمت کریں۔

جو تخلیقات کسی وجہ سے شائع نہیں ہوں گی، ان کی واپسی کے لئے اکادمی ذمہ دار نہیں ہوگی۔

تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔ پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

اتر پردیش اردو اکادمی بچوں کے مزاج ومعیار کے لحاظ سے

ماہنامہ باغیچہ

پورے آب وتاب کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ اس کے فروغ اور توسیع کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے۔

۱۔ آپ اپنی تخلیقات بھیج کر

۲۔ خود خریدار بن کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر

۳۔ بچوں میں اردو رسائل پڑھنے کا ذوق بیدار کر کے

اردو کی خدمت کر سکتے ہیں۔

فاروقؔ جائسی
سول لائن، کانپور-Mob.9839375197

غزل

عشق والے کبھی مغموم نہیں ہونے کے
جاں سے جائیں بھی تو مرحوم نہیں ہونے کے

دلِ ناداں کو سمجھ دار بنا رکھا ہے
عشق اب ہم ترے محکوم نہیں ہونے کے

سامنے سے وہ نکل جائیں اشارہ نہ کریں
ہم تو اب اتنے بھی معصوم نہیں ہونے کے

سامنے ان کے جو زانوئے ادب تہہ نہ کریں
ایسے خادم کبھی مخدوم نہیں ہونے کے

اپنے ہی نام سے تاریخ میں پائندہ ہیں
آج کے نام سے موسوم نہیں ہونے کے

چھل کپٹ زور زبردستی سے جو چھینی گئی
اس کی یادوں سے تو محروم نہیں ہونے کے

ہم اگر بتّی کی خوشبو کی طرح ہیں فاروقؔ
جو دُھواں ہو کے بھی معدوم نہیں ہونے کے

●●●

سعید الحسن خاں گہرؔ خیرآبادی
خیرآباد، سیتاپور-Mob.9307077007

غزل

رنگ طبیعت خوب بدلتے دیکھا ہے
موم کی صورت سنگ پگھلتے دیکھا ہے

دل کی جولانی پہ یقیں اب آیا مجھے
موجوں کو دریا میں اُچھلتے دیکھا ہے

ٹھوکر سے گھبرانا کیسا ہم نے تو
گرتے ہوئے انساں کو سنبھلتے دیکھا ہے

ایک نیا دن دنیا کو دینے کے لئے
سورج کو ہر روز نکلتے دیکھا ہے

سایہ دینا بھی کوئی آسان نہیں
ہم نے پیڑ کو دھوپ میں جلتے دیکھا ہے

منزل سے وہ بیگانہ ہے پھر بھی اسے
راہ میں آگے آگے چلتے دیکھا ہے

راہِ وفا میں رہنا ہے محتاط گہرؔ
بڑے بڑوں کو یہاں پھسلتے دیکھا ہے

●●●

شعیب نظام
چمن گنج، کانپور-Mob.8960416841

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد: ایک بے ریا شخصیت

بی اے پاس کرنے کے بعد والدہ کی خواہش کے مطابق میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا میری والدہ کی خواہش تھی میں وکالت پڑھ کر بارہ بنکی یا تحصیل میں وکالت کروں جس سے آراضی کی دیکھ بھال بھی آسانی سے ممکن ہو سکے۔ میرے کلاس جب ختم ہو جاتے تھے تو میں پرویز علوی جو شمسی مینائی صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے اور اردو میں ایم اے کر رہے تھے ان کو لینے شعبۂ اردو کے باہر ان کا انتظار کرتا تھا ان کا آخری پیریڈ ملک زادہ صاحب لیتے تھے۔ ملک زادہ صاحب کی آواز کی کشش مجھے بار بار اپنی طرف کھینچتی تھی میں نے پرویز سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ پہلے اردو میں ایم اے کر لیجئے اس کے بعد ایل ایل بی کرنا کون سا مشکل کام ہے میں نے والدہ سے مشورہ کیا کہ انہوں نے شاید میرا دل رکھنے کے لئے اپنی رضا مندی دے دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ یونیورسٹی میں نیتا گیری اپنے عروج پر تھی بارہ بنکی کے ایک معروف یونین لیڈر سے میں نے اپنا مسئلہ بتایا انہوں نے کہا کہ چلئے آپ کی فیس ایل ایل بی سے ایم اے (اردو) میں ٹرانسفر کرائے دیتے ہیں اور واقعی ایک دو دن کی دوڑ بھاگ میں میرا نیا فارم اور فیس اردو ڈیپارٹمنٹ منتقل ہوگئی۔ اس طرح میں نے ایم اے (اردو) جوائن کر لیا۔

ملک زادہ صاحب کے بڑے صاحب زادے جاوید ملک زادہ میرے کلاس فیلو تھے بہت جلد ان سے دوستی ہوگئی اور وکٹوریہ اسٹریٹ واقع حسنین مارکیٹ میں ملک زادہ صاحب کے گھر پر آنا جانا ہونے لگا میں اور جاوید دونوں شاعری کرتے تھے اور وہ علاقہ شاعروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہم لوگ نشستوں میں شریک ہونے لگے کبھی کبھی دیر ہو جانے پر ملک زادہ صاحب کے گھر پر ہی رات رک جاتا تھا ملک زادہ صاحب بہت شفقت سے پیش آتے تھے اور لکھنے پڑھنے کا کوئی کام جو اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہیں کر پاتے تھے وہ میرے سپرد کر دیتے تھے اور کام پورا ہو جانے پر عام طور پر بریانی وغیرہ منگا کر اپنے طور پر شاباشی دیتے تھے۔

کلاس میں ملک زادہ صاحب بہت کم آتے تھے جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ملک بھر کے مشاعروں میں زیادہ مصروف رہتے تھے اس زمانہ میں ملک میں جتنے بھی مشہور

مشاعرے منعقد ہوتے تھے زیادہ تر کی نظامت ملک زادہ صاحب ہی کرتے تھے مگر جس دن وہ کلاس میں آتے تو وقت کا کوئی تعین نہیں ہوتا تھا جوشؔ ملیح آبادی پر ملک زادہ صاحب دو دو دن تک کئی کئی گھنٹے اپنا لیکچر دیتے رہتے تھے جو بہت مدلل اور متاثر کن ہوتا تھا اور کبھی کبھی یہ صورت بھی ہو جاتی تھی کہ وہ ایک دن میں ہی کئی شاعروں پر لیکچر دے کر گویا ان شاعروں کو بھی نپٹا دیتے تھے۔ ملک زادہ صاحب کا رویہ اپنے طالب علموں سے تقریباً دوستانہ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں مجھے سگریٹ سے کافی رغبت تھی یہ بات ملک زادہ صاحب کے علم میں تھی وہ اور پروفیسر شبیہ الحسن صاحب سگریٹ پیتے ہوئے کلاس لیتے تھے ملک زادہ صاحب کے پاس جب کبھی سگریٹ ختم ہو جاتی تو وہ مجھ سے استفسار کر لیتے کہ کیا میرے پاس سگریٹ موجود ہے ایسی صورت میں زیادہ تر میں ان کی خدمت میں سگریٹ پیش کر دیتا اور سگریٹ سلگانے کے بعد ان کا لیکچر جاری رہتا۔ نسیم نکہت بھی میری کلاس فیلو تھیں اور ملک زادہ صاحب کے ساتھ مشاعرے پڑھنے کی وجہ سے وہ ان سے خاصی بے تکلف بھی تھیں ایک دن کلاس میں ان کی کسی بے تکلفی پر ملک زادہ صاحب نے فرمایا کہ نسیم مشاعروں میں آپ ایک شاعرہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور کلاس میں محض ایک طالب علم ہیں میرا خیال ہے کہ آپ کو اس کا لحاظ رکھنا چاہئے اس کے بعد نسیم نکہت واقعی ایک طالب علم میں تبدیل ہو گئیں۔

ایم اے کے دوسرے سال میں شافع قدوائی، محسن خاں اور ندیم اشرف جائسی بھی اردو ڈپارٹمنٹ آ گئے شعبہ کا ماحول ہی ایسا تھا کہ بہت جلد ان نو آوردگان سے دوستی ہو گئی کبھی کبھی کمبائنڈ کلاس بھی ہوتے تھے خصوصاً ملک زادہ صاحب کمبائنڈ کلاس زیادہ لیتے تھے کیونکہ انہیں مشاعروں کی وجہ سے پابندی سے کلاس لینے کی فرصت نہیں ملتی تھی اس لئے وہ چاہتے تھے کہ جتنا بھی وقت مل سکے وہ اپنے طالب علموں کو دے سکیں۔

ملک زادہ منظور صاحب اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور تاریخ میں بھی ماسٹر کی ڈگری حاصل کر چکے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی آنے سے پہلے شبلی کالج میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے پڑھا بھی چکے تھے مگر میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ ملک زادہ صاحب کی شخصیت تصنع اور جھوٹے دکھاوے سے پوری طرح پاک تھی۔ انہوں نے ایک دن کلاس میں دریافت کیا کہ کیا آپ حسن نعیم سے واقف ہیں شافع اور میں نے اثبات میں جواب دیا ملک زادہ صاحب نے ہنستے ہوئے بتایا کہ پچھلے مشاعرے میں وہ شریک تھے مگر میں اتفاق سے ان سے واقف نہیں تھا اس لئے میں نے صرف ان کے نام کا اعلان کر کے انہیں ڈائس پر مدعو کر لیا کلام پڑھنے کے بعد وہ میرے پاس آئے اور وقت ملنے پر مجھ سے پوچھا کہ جناب آپ کیا کرتے ہیں میں نے بتایا

کہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر ہوں حسن نعیم بولے کہ جناب آپ کو تو پروفیسر ہونا چاہئے۔ ملک زادہ صاحب نے سادگی سے جواب دیا کہ صدر شعبہ شبیہ الحسن صاحب ہیں ان کے سبکدوش ہونے کے بعد پوسٹ خالی ہوگی حسن نعیم نے جواب دیا کہ جناب آپ کی غفلت تو پروفیسروں والی ہے تب ملک زادہ صاحب کی سمجھ میں ان کا طنز آیا۔ کلاس میں یہ واقعہ سنانا ملک زادہ صاحب کے بڑے انسان ہونے کی دلیل ہے وہ خود پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتے تھے جواب تقریباً نایاب ہوگیا ہے میں نے یہ حوصلہ کسی دوسرے پروفیسر میں کبھی نہیں دیکھا۔

ایک دوسرا واقعہ بھی اسی قبیل کا مجھے یاد آرہا ہے ہم لوگوں نے صلاح الدین پرویز کے اعزاز میں پریس کلب میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا تھا جس میں شرکت کے لئے ڈاکٹر صاحب سے بھی گذارش کی گئی تھی میں جب کلاس سے نکلنے لگا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے روک کر دریافت کیا کہ آپ پروگرام میں کس طرح جائیں گے میں نے جواب دیا ڈاکٹر صاحب میں سائیکل سے پہونچ جاؤں گا انہوں نے حکم دیا کہ آپ میرے ساتھ رکشہ پر چلئے گا راستے میں گومتی کے پُل پر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ صلاح الدین پرویز کیا کرتے ہیں پہلے تو میں سوال کی نوعیت ہی نہیں سمجھ پایا اس لئے میں ان کے کاروبار کے بارے میں بتانے لگا مگر جب ملک زادہ صاحب نے سوال واضح کیا تو میں نے عرض کیا کہ صلاح الدین پرویز نظم کے بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کے دو ناول بھی منظر عام پر آچکے ہیں مگر ناولوں کے بارے میں بڑی کانٹوورسی ہے کہ یہ ناول ان کے لکھے ہوئے ہیں یا احمد ہمیش کے ڈاکٹر صاحب بولے بس بس میں سمجھ گیا اور پروگرام میں ملک زادہ صاحب نے اپنی تقریر میں سارا زور متنازع شخصیت پر دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ بڑی شخصیتیں عام طور پر متنازعہ ہوتی ہیں اس لئے صلاح الدین پرویز کے بڑے فنکار ہونے میں مجھے کوئی کلام نہیں ہے اور سب سے زیادہ تالیاں ملک زادہ صاحب کی تقریر پر ہی بجیں۔

میرے ایم اے میں داخلہ لینے کے کچھ عرصہ پہلے ہی ملک زادہ صاحب نے دوسری شادی کر لی تھی وہ بھی ایک خوش اخلاق خاتون تھیں جبکہ ان کی پہلی بیوی یعنی ملک زادہ جاوید کی والدہ سے میں زیادہ مانوس تھا اس لئے ملک زادہ صاحب کے گھر برابر جانا ہوتا تھا اور ان کے گھر کے سارے افراد بہت محبت اور اپنے پن سے ملتے تھے وہ اکثر بھول جاتے تھے اور مجھ سے پوچھتے تھے کہ تمہاری چھوٹی آنٹی تمہاری کلاس فیلو تھیں نا میں ہمیشہ جواب دیتا کہ وہ میری سینئر ہوتی تھیں ان کی دوسری شادی کے وقت گھر میں کچھ تناؤ رہا تھا جو عین فطری بھی تھا مگر دھیرے دھیرے صورت حال اعتدال پر آگئی تھی اور گویا سب نے چاہتے نا چاہتے ہوئے بھی اسے قبول کرلیا تھا۔

ملک زادہ صاحب کے گھر جب شام کو میں حاضر ہوتا تو مجھے کبھی کبھی وہ کہتے کہ چلو امین آباد چلتے ہیں تھوڑی دیر غیبت کدہ میں بیٹھیں گے غیبت کدہ سے ان کی مراد والی آسی بھائی کا مکتبۂ دین وادب ہوتا تھا ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک لمریٹا اسکوٹر تھی وآلی بھائی کے مکتبہ پر دو ایک شاعروں کا آنا جانا برابر لگا رہتا تھا۔

ان دنوں وہاں عرفان صدیقی، انجم ملیح آبادی، انور ندیم اور باہر سے کسی مشاعرہ سے آنے والے دو ایک شاعر یا کسی مشاعرہ میں جانے والے شاعر بھی موجود ہوتے تھے ملک زادہ صاحب اکثر ایک مصرعہ پڑھتے اور والی صاحب سے دوسرا مصرعہ لگانے کی فرمائش کرتے اگلے شعر کے لئے (وہ عرفان صاحب سے بھی جن سے ان کے دوستانہ مراسم تھے) عرفان صاحب سے اگلے شعر کی فرمائش کرتے اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد تقریباً پانچ شعر پورے ہو جاتے ملک زادہ صاحب خود بہت اچھے شاعر تھے مگر یونیورسٹی کی ملازمت بورے ملک میں مشاعروں کے لئے سفر اور دو دو گھروں کی ذمہ داریاں انہیں وقت ہی نہیں دیتی تھیں کہ وہ سنجیدگی سے شاعری یا ادب کی طرف رجوع کر سکیں۔

ابوالکلام آزاد پر ڈاکٹر صاحب نے پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھا تھا جو کتابی شکل میں موجود ہے اسے پڑھ کر آسانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بہت عمدہ نثر لکھنے پر قادر تھے اور اپنی بات خاصے مدلل انداز میں کہنے کی ان میں بلا کی صلاحیت تھی مگر ملک بھر میں مشاعرے انہیں ایک کونے سے دوسرے کونے تک کھینچتے رہتے تھے اور یہ بھی سچ ہے جب ملک زادہ صاحب نے مشاعروں میں نظامت کی ابتدا کی تھی وہ ان کی نو جوانی کا عالم تھا اس وقت مشاعروں میں جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، مجاز لکھنوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری اور فراق گورکھپوری جیسے شعراء شریک ہوتے تھے اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مشاعرے ہماری تہذیب اور ادب کی پرورش کرتے تھے اور ان کی نمائندگی تھی ایک زمانہ تک پورے ملک میں اس معیار کے شاعر مشاعروں میں موجود ہوتے تھے اور ان کے مرتبہ کے اعتبار سے ناظم کا سخت امتحان ہوتا تھا کہ کس کو کہاں پڑھایا جائے جس سے اس کی دل شکنی بھی نہ ہو اور سامعین پورے مشاعرہ سے لطف اندوز بھی ہو سکیں ۔ ڈاکٹر صاحب ایک زمانہ تک اس سخت امتحان سے بہت ثابت قدمی کے ساتھ گذرے اس زمانہ میں سامعین کا معیار بھی خاصا بلند ہوتا تھا اور اچھے شعروں پر بھرپور داد بھی ملتی تھی اور سامعین کی طرف سے جو جملے بھی اچھالے جاتے تھے ان میں بھی عامیانہ پن بالکل نہیں ہوتا تھا ۔ ملک زادہ صاحب بتاتے تھے کہ جگر مرادآبادی صاحب جب اپنی غزلیں سناتے تھے تو سامعین پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ مجاز نو جوانوں

کے سب سے مقبول شاعر تھے اوران سے تقریباً ہر مشاعرہ میں ان کی مشہور نظم 'آوارہ' کی فرمائش کی جاتی تھی اپنے آخری مشاعرہ میں مجاز نے اپنی غزلیں پیش کیں اور جب سامعین آوارہ کی زیادہ فرمائش کرنے لگے تو مجاز نے یہ جملہ کہہ کر ڈائس چھوڑ دیا کہ بھائی اب وہ بہت زیادہ آوارہ ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بتاتے تھے کہ جوش ملیح آبادی اپنی نظم آہا آہا برکھا آئی ایک خاص وجد کی کیفیت میں سناتے تھے اور نظم کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ان کے دائیں ہاتھ کی کہنی حرکت کرتی رہتی تھی بقول ڈاکٹر صاحب جوش کی ایک اور نظم'' کیا گل بدنی گل بدنی گل بدنی ہے'' بھی مشاعروں میں بہت مقبول ہوتی تھی اوراس نظم کو بھی جوش ایک والہانہ انداز سے ہی پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب جب ماضی کے ان مشاعروں کا ذکر کررہے ہوتے تھے ان کی آنکھیں چھلکنے لگتی تھیں اور ہم لوگ مبہوت ہوکر گویا ان مشاعروں کے سامعین میں تبدیل ہو جاتے تھے مگر دھیرے دھیرے مشاعروں سے یہ بڑے لوگ اٹھتے چلے گئے اوراس کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی وہ ادبی فضا بھی گرتی چلی گئی جو عین فطری بھی تھی مگر ملک زادہ صاحب نے مشاعروں کی نظامت میں کبھی لطیفہ گوئی یا عامیانہ پن سے کام نہیں لیا خاصے دن پہلے انہوں نے اپنے شاگرد انور جلال پوری سے ایک آدھ مشاعروں میں ساتھ بیٹھ کر نظامت کروائی۔ بشیر بدر بھی مشاعروں کی نظامت کرنے لگے تھے ایک دن میری موجودگی میں ملک زادہ صاحب نے انور جلال پوری صاحب سے کہا تھا کہ بشیر بدر اچھے شاعر ہیں جبکہ تم اچھے ناظم ہو سکتے ہو اس لئے ساری توجہ مشاعروں کی نظامت پر لگاؤ اور وقت نے دیکھا کہ ملک زادہ کی موجودگی میں ہی انور جلال پوری صاحب نے مشاعروں کی نظامت میں اپنا ایک مقام بنالیا تھا مگر یہاں پر مجھے انور جلال پوری کے حوالہ سے ایک شعر یاد آرہا ہے ۔

تجھ کو اتنا کچھ بنانے میں مرا بھی ہاتھ ہے
میری جانب دیکھ میں بھی تیرے پس منظر میں ہوں

انور جلال پوری کو نظامت میں لانے اور انہیں مستحکم کرنے میں ملک زادہ صاحب کا بنیادی کردار تھا وہ اپنے شاگردوں سے واقعی محبت کرتے تھے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ نشور واحدی صاحب کا ٹی وی کے لئے انٹرویو کرنا ہے مگر نشور صاحب کا اصرار ہے کہ میں ان سے پہلے مل لوں تم بھی چلو نشور صاحب مسلم مسافر خانے واقع چار باغ میں رکے ہوئے تھے۔ بارش کا موسم تھا چار باغ سے مسلم مسافر خانے تک جانے والی روڈ بہت خراب اور پھسلن بھری تھی بہر حال ہم لوگ پہنچ گئے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میری فرمائش پر نشورؔ صاحب نے اپنے مخصوص ترنم میں دو غزلیں سنائیں۔ تھوڑی دیر بعد ملک زادہ صاحب نے دریافت کیا کہ آپ نے کہلایا تھا کہ ریکارڈنگ

سے پہلے مجھ سے مل لیجئے۔فرمایئے میرے لائق کوئی خدمت، نشور صاحب نے فرمایا آپ مجھ سے اقبال کے تصورِ خودی پرضرور سوال کیجئے گا ۔ ڈاکٹر صاحب کچھ سمجھ نہیں پائے انہوں نے کہا کہ آپ مطمئن رہئے میں آپ کی شاعری کے حوالے سے سوالات کرلوں گا۔مگرنشور صاحب اپنے سوال پر قائم رہے ڈاکٹر صاحب کے استفسار پرنشور صاحب بولے میں نے اقبال کے فلسفۂ خودی کورد کردیا ہے کیا میری کتاب آپ کی نظر سے نہیں گزری۔ اب حیران ہونے کی باری ہماری اورڈاکٹر صاحب کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب لاکھ سمجھاتے رہے کہ نشور صاحب آپ کی شاعری میں اور بھی بہت کچھ ہے میں گفتگو کرلوں گا مگرنشور صاحب تقریباً ضد پر اڑے ہوئے تھے کہ صاحب یہ سوال بہت ضروری ہے۔ بہرحال ہم لوگ باہر آگئے ڈاکٹر صاحب دیرتک ہنستے رہے پتہ نہیں ریکارڈنگ میں ڈاکٹر صاحب نے یہ سوال پوچھا یا نہیں مگر مجھے یاس یگانہ چنگیزی بہت یاد آئے۔

ملک زادہ صاحب اورشمس الرحمٰن فاروقی ایک زمانہ میں شبلی کالج میں انگریزی کے استاد رہ چکے تھے اس لئے دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف بھی تھے شب خون میں فاروقی صاحب نے جرأت کوخراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک طویل نظم لکھی جرأت نے اپنی مثنوی میں جانوروں کا ذکر کیا تھا اور شاید ہی کوئی جانوران کی مثنوی سے باہر رہ سکا ہو۔ فاروقی صاحب نے اپنی نظم میں پرندوں کا ذکر کیا تھا اور فاروقی کی بھی یہ کوشش تھی کہ کوئی بھی پرندہ نظم سے باہر نہ رہ سکے نظم میں ایسے مشکل الفاظ استعمال ہوئے تھے کہ جب میں نے ملک زادہ صاحب کو وہ نظم پڑھوائی تو وہ دیر تک ہنستے رہے اور بولے کہ اس نظم کی صحیح قرأت آج کل کے پروفیسر بھی آسانی سے نہیں کرسکتے۔

نظم کی تعریف میں انہوں نے فاروقی صاحب کوایک خط بھی لکھا تھا جس کا بہت محبت بھرا جواب فاروقی صاحب کی طرف سے آیا فاروقی صاحب نے لکھا تھا کہ میں خود آپ کا مداح رہ چکا ہوں ملک زادہ صاحب ۔ فاروقی صاحب کے خط سے بہت خوش ہوئے تھے۔

مگراس کے برعکس ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے کہ ٹیلی ویژن لکھنؤ نے ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا تھا جس کی نظامت ملک زادہ صاحب کررہے تھے فاروقی صاحب اورعرفان صدیقی صاحب پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے اورمشاعرہ کے دوران یہ دونوں حضرات کسی شعر یا کسی موضوع پر گفتگو بھی کرتے جاتے تھے مشاعرہ ریکارڈ ہونے کے بعد ملک زادہ صاحب نے بھری محفل میں فاروقی صاحب سے خاصے سخت لہجہ میں اپنی ناراضگی درج کرائی ملک زادہ صاحب جب اپنی بھڑاس نکال چکے تو فاروقی صاحب صرف اتنا کہتے رہے کہ چلو ہوگیا ملک زادہ صاحب اور یہ بات ختم ہوگئی فاروقی

صاحب نے ایک طرح سے اس واقعہ کو تماشہ نہیں بننے دیا کئی دن بعد جب میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو ملک زادہ صاحب نے صرف اتنا کہا کہ کبھی کبھی ہو جاتا ہے بھائی میں نے محسوس کیا کہ بعد میں ملک زادہ صاحب کو بھی اپنا رویہ کچھ زیادہ سخت معلوم ہوا ہوگا اور انہیں اپنے ایک اچھے دوست کے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آنے پر افسوس ضرور تھا۔

شعبہ میں شبیہ الحسن صاحب کے رویہ سے کبھی کبھی ملک زادہ صاحب برہم ہو جاتے تھے ایک بار شبیہ الحسن صاحب غالباً رخصت پر تھے ملک زادہ صاحب نے ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ پینٹ شرٹ پہننے والا کوئی بھی شخص حق پر ہوتے ہوئے بھی کسی شیروانی پہننے والے شخص سے جیت نہیں سکتا ظاہر ہے یہاں شیروانی پہننے والے شخص سے مراد صدر شعبہ شبیہ الحسن صاحب ہی تھے۔ انہوں نے غصہ میں میز پر رکھا ہوا قلمدان دیوار پر پھینک دیا اور اٹھ کر شعبہ سے باہر چلے گئے میں نے اپنی پوری طالب علمی کے زمانہ میں ملک زادہ صاحب کو پہلی بار غصہ میں دیکھا تھا ورنہ عام طور پر ان کی خوش مزاجی ہمیشہ قائم رہتی تھی جو ان کی شخصیت کا ایک لازمی جزو تھا۔

مشاعروں میں دھیرے دھیرے اس حد تک زوال آ گیا تھا کہ طے شدہ پیمنٹ کو بڑھانے پر اچھے اچھے شعراء کنوینر سے بحث کرتے نظر آتے تھے اور دلیل دیتے تھے کہ تین اہم شاعر آپ کے مشاعرہ میں نہیں آئے اس لئے میری طے شدہ رقم میں اضافہ کرا دیا جائے اس طرح کے ایک واقعہ کا ذکر بے موقع نہ ہوگا اطہر نبی صاحب میری طالب علمی کے زمانہ میں بہت بڑے بڑے مشاعرے منعقد کرتے تھے اسی طرح کا ایک پروگرام گومتی کے کنارے منعقد کیا گیا تھا جو ہر لحاظ سے بہت کامیاب مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد اطہر نبی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ شعیب تم کس طرح جاؤ گے میں نے جواب دیا دوستوں کے ساتھ نکل جاؤں گا اطہر صاحب نے اصرار کیا کہ میں امین آباد چل رہا ہوں آپ میری گاڑی پر بیٹھ جایئے ابھی گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ شمیم جے پوری صاحب گاڑی کے قریب آ گئے اور اطہر صاحب سے طے شدہ رقم سے ایک ہزار روپئے زیادہ دینے کی فرمائش کرنے لگے اطہر نبی نے انہیں جواب دیا کہ شمیم صاحب آپ نے خط میں جتنی رقم کا مطالبہ کیا تھا وہ آپ کو پیش کی جا چکی ہے مگر شمیم صاحب حوالہ دینے لگے کہ دو شاعر نہیں آئے ہیں اور میں نے آپ کے مشاعرہ کے لئے ایک دوسرا مشاعرہ چھوڑ دیا ہے اس لئے مجھے ایک ہزار روپئے مزید دے دیں تو مناسب رہے گا اطہر صاحب تھوڑی دیر تک ان کو سمجھاتے رہے اور پھر غصہ میں انہوں نے سو سو کے دس نوٹ زمین پر پھینک دیئے اور شمیم جے پوری سے بولے کہ فوراً اٹھا لیجئے اور پچھلی گاڑی میں بیٹھ جایئے اس کے بعد کوئی سواری

نہیں ملے گی شمیم صاحب روپئے اٹھا کر پچھلی گاڑی میں بیٹھ گئے میں جب گھومتا گھامتا وآلی صاحب کی دکان پر پہنچا تو شمیم صاحب اپنا قصہ بیان کررہے تھے کہ اطہر نبی صاحب نے ان کے ساتھ خاصی بدسلوکی کی ہے۔ وآلی صاحب کا جواب تھا کہ جب اطہر صاحب کوئی پروگرام کرتے ہیں اس دن وہ فرعون بے ساماں کی طرح نظر آنے لگتے ہیں میں نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے عرض کیا کہ وآلی بھائی ساری غلطی شمیم صاحب کی ہے اور میں نے پورا واقعہ دہرایا شمیم صاحب بالکل خاموش ہوگئے وآلی بھائی نے کچھ کہنا چاہا مگر رک کر مجھ سے بولے کہ شعیب ذرا تین چائے کے لئے آواز دے دینا اور چائے پینے کے درمیان بھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی اس کے برعکس میں نے مشاعروں میں خمار بارہ بنکوی اور ملک زادہ صاحب کو ہمیشہ دیکھا کہ لفافہ لے کر شکریہ ادا کرتے ہوئے لفافہ جیب میں رکھ لیتے تھے کبھی کنوینر کے سامنے لفافہ کھولنا بھی آداب کے خلاف سمجھتے تھے پیسوں کا مطالبہ تو دور کی بات شاید اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہوگی کہ ملک زادہ صاحب اور خمار بارہ بنکوی جب مشاعروں کی دنیا میں داخل ہوئے تھے تب مشاعروں کا معیار اور انسانی قدریں اپنے عروج پر تھیں۔ مشاعرے کا معیار اور قدریں دھیرے دھیرے زوال پزیر ہوتی رہیں مگر کم سے کم ان دونوں حضرات نے اپنے طور پر اپنی ذات تک ان قدروں کو سینے سے لگائے رکھا۔

آج نہ خمار صاحب ہیں اور نہ ہی ملک زادہ صاحب اللہ دونوں کو غریق رحمت کرے۔ اب دھیرے دھیرے ایسے روشن چہرے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترس جاتی ہیں ہوسکتا ہے ابھی کچھ لوگ ہوں جو ان قدروں کے امانت دار بھی ہوں مگر ان تک میری رسائی نہیں ہے اب ہم جس مادی دور میں جی رہے ہیں وہاں دوسرا ملک زادہ منظور احمد شاید ہی پیدا ہوسکے۔

ملک زادہ صاحب نے آخر میں ''رقص شرر'' کے عنوان سے اپنے بارے میں اور مشاعروں کی پوری تاریخ کو قلم بند کردیا ہے یہ کتاب جہاں ایک طرف ملک زادہ صاحب کے توانا اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے وہیں دوسری طرف مشاعروں کی پوری تاریخ بھی ہمارے سامنے لے آتی ہے۔ اس کتاب کے حوالہ سے ہم ان قدروں کی بازیافت بھی کرسکتے ہیں جو کبھی ہمارے مشاعروں کی شان ہوا کرتی تھیں۔ ملک زادہ صاحب جہاں ایک طرف اعلیٰ قدروں کو مشاعرے میں پروان چڑھتے ہوئے بھی دیکھا تھا وہیں آخر آخر ان قدروں کو ٹوٹتے بکھرتے بھی دیکھا۔ میری طالب علمی کے زمانہ میں پرویز ملک زادہ عمر میں خاصے چھوٹے تھے مگر آج لکھنؤ کی فعال ادبی شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے جس پر میں دل ہی دل میں ایک خوشی سی محسوس کرتا ہوں۔

❑❑❑

ڈاکٹر فرقانؔ سردھنوی
سردھنا، میرٹھ-Mob.9927141402

غزل

اعلان کر رہی ہے یہ اُردو اِدھر اُدھر
محسوس کیجئے مری خوشبو اِدھر اُدھر

منزل کی آرزو ہے تو منزل تلاش کر
پھرتا ہے مارا مارا عبث تو اِدھر اُدھر

اک پل کو آپ آئے تھے بزم خیال میں
پھیلی ہوئی ہے آج بھی خوشبو اِدھر اُدھر

اپنے پروں میں پرتو نورِ قمر لئے
تاریکیوں سے لڑتے ہیں جگنو اِدھر اُدھر

پہلے تو دل میں آتا ہے اس کا حسیں خیال
پھر دیکھتا ہوں غور سے ہر سو اِدھر اُدھر

ناچی ہے اک غریب طوائف تمام رات
بکھرے پڑے ہیں فرش پہ گھنگھرو اِدھر اُدھر

فرقانؔ جب سے پھیلیں ان آنکھوں کی شہرتیں
پھرتے ہیں بے قرار سے آہو اِدھر اُدھر

●●●

یٰسین ابن عمر
فتن سرائے، سیتاپور-Mob.9807023540

غزل

مری ناکام ہر تدبیر اب بھی ہے
جدائی اُن کی دامن گیر اب بھی ہے

یہاں کہنے کو میں آزاد ہوں لیکن
مرے پیروں میں اک زنجیر اب بھی ہے

وطن کے جاں نثاروں میں تھا کل میں بھی
مرے حصے میں یہ جاگیر اب بھی ہے

لیا تھا جس نے گردن کا مری بوسہ
لہو سے سرخ وہ شمشیر اب بھی ہے

لکھی تھی مدتوں پہلے جو اشکوں سے
نہ جانے کیوں وہ نم تحریر اب بھی ہے

ترے ہونٹوں کے ترکش سے جو نکلا تھا
چبھا دل میں مرے وہ تیر اب بھی ہے

نہیں ہے دسترس یٰسینؔ اردو پر
مگر غالبؔ ہے کوئی میرؔ اب بھی ہے

●●●

ندیم راعی مرادآبادی
گل شہید، مرادآباد-Mob.8188937127

خالی خالی کرسیاں

وہ بوڑھی عورت ڈھیلے ڈھال میلے کچیلے کپڑے پہنے اپنے لاغر سراپے کو ایک بوسیدہ سی میلی چادر سے ڈھکے چیئرمین صاحب کی حویلی کے باہر ٹین شیڈ میں ایک دوسرے سے جڑی لوہے کی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئی تھی شدت کی سردی سے وہ کانپ رہی تھی ہر سو کہرے کی چادر پیر پسارے تھی دن رات لگ رہا تھا دھوپ کا نام ونشان نہیں تھا۔ ٹین شیڈ سے چھن چھن کر سردی اس کے جسم میں پیوست ہو رہی تھی۔ چاروں سمت سے سن سن کرتی ہوائیں اس کا استقبال کر رہی تھیں۔ پورے ٹین شیڈ میں وہ تن تنہا تھی باقی سب کرسیاں خالی خالی تھیں۔ دور تک سناٹا ہی سناٹا نہ آدم اور نہ کوئی آدم زاد کبھی کبھار کوئی گاڑی موٹر سائیکل ادھر سے گذر جاتی۔ وہ سردی کی شدت سے اتنی پریشان نہیں تھی جتنی ان خالی خالی کرسیوں کو دیکھ کر پریشان تھی کہیں آج وہ بہت پہلے تو یہاں نہیں آگئی یا پھر مرغ نے قبل از وقت بانگ تو نہیں دے دی؟ پچھلے سال وہ ان ہی سردیوں کے دنوں میں ہی تو یہاں آئی تھی یہی وقت ایسی ہی شدت کی سردی تھی گھنے کہرے اور برفیلی ہواؤں کے باوجود یہاں کی ساری کرسیاں لوگوں سے بھری تھیں۔ دسیوں عورت و مرد اپنی مسکین شکل لئے سوالی بنے کھڑے تھے چیئرمین صاحب کے پیارے ادھر اُدھر گشت کر رہے تھے۔

میونسپلٹی کے اہلکار، بابو شہر کے دیگر معززین تازہ دم چہرے اور حسین مسکان سجائے آتے اور سیدھے حویلی کی بیٹھک میں داخل ہو جاتے لیکن ہمارے لئے ملاقات کا وقت ۱۰ بجے کا ہی طے تھا اور دس بجے ہی ہمارے لئے بیٹھک کا دروازہ کھلا چپراسی نے ایک ایک کو اندر بھیجنا شروع کیا ایک واپس آجاتا تو دوسرا اندر جاتا۔ ان کے علاوہ موٹر سائیکل کاروں سے آنے والے صاحبان براہ راست اندر چلے جاتے اور چیئرمین صاحب بڑی خندہ پیشانی سے انھیں اپنے پاس پڑے صوفوں و کرسیوں پر بٹھاتے۔ سامنے لگی میزوں پر چائے بسک دال موٹھ کی پلیٹیں بھی تھیں اور ایک تھرمس میں چائے جس سے یہ حضرات لطف اندوز ہو رہے تھے اگر ان میں سے کوئی ہاتھ روک لیتا تو انھیں چیئرمین صاحب مزید لینے کا اشارہ کرتے لیکن ہمارے لئے نہ صوفے نہ کرسیوں پر بیٹھنے کی اجازت اور نہ ہی چائے بسکٹ وغیرہ لینے کا اختیار؟ چیئرمین صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے مسائل و فریاد پیش کرتے اور چیئرمین صاحب وہیں بیٹھے بیٹھے فریادیں سن کر ان کا سد باب کرتے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ مطمئن ہو کر اپنے گھروں کی طرف رخ کر لیتے۔ وہ بوڑھی عورت بھی اپنا ایک مسئلہ لے کر آئی تھی جسے حسب منشا چیئرمین صاحب نے حل کر دیا تھا۔

لیکن آج تو دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا وہ تن تنہا ایک کرسی پر براجمان تھی اور باقی خالی کرسیاں محو انتظار تھیں کوئی آئے اور ان پر بیٹھ جائے لیکن وہ تمام کرسیاں خالی تھیں اور خالی ہی رہیں..... وقت بڑی آہستہ آہستہ گذر رہا تھا۔ لمبے انتظار کے بعد ملاقات کا وقت قریب آنے کو تھا لیکن پھر بھی اللہ کا کوئی بندہ وارد نہیں ہوا وقت گذرنے کے ساتھ پریشانی بتدریج بڑھتی جارہی تھی جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کا تجسس دراز ہوتا جارہا تھا۔ اب دس بجنے کو تھے لیکن اس کے علاوہ دوسرا کوئی وہاں نہیں تھا اور نہ ہی حویلی سے کوئی باہر نکلا تھا۔ چیئر مین صاحب کے چیلے چپاٹے جو یہاں صف بندی کراتے اور ہدایتیں کرتے رہتے تھے، ندارد تھے۔ پھر اس نے سوچا کہ کہیں وہ چیئر مین کی حویلی جیسی کسی اور شخص کی حویلی کے دروازے پر تو نہیں آ بیٹھی ہے اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی میلی کچیلی کپڑے کی پوٹلی اپنی کرسی پر رکھ کر سڑک پر آ کھڑی ہوئی دس منٹ کے انتظار کے بعد ایک پندرہ سالہ لڑکا جس کی پیٹھ پر اسکول بیگ تھا وہاں سے گذر رہا تھا اس نے اسے روک کر پوچھا ''بچو! یہ چیئر مین ساب کی حویلی ہے'' اور اس لڑکے نے کہا کہ ہاں یہ چیئر مین صاحب کی حویلی ہے تب اس کی جان میں جان آئی اور وہ پھر اپنی پوٹلی اٹھا کر اپنی گود میں رکھ کر اسی کرسی پر بیٹھ گئی جیسے وہ پوٹلی نہ ہو بلکہ کوئی انمول شے ہو یا پھر کوئی خزانہ....؟ اور سوچنے لگی کہ وہ اس بار چیئر مین ساب سے سفارش کر کے اپنے گاؤں کے پردھان سے اپنی جھونپڑی پر چھپر چھانے لیٹرین بنوانے کا انتظام کرا ہی لے گی تا کہ برسات میں اس کے چھپر کے اندر برسات نہ ہو اور رفع حاجت کے لئے کھیتوں میں جانا نہ پڑے؟ اب یہ بوڑھی اس قابل نہیں رہی کہ خود کو وقت بے وقت پانی میں ڈبویا جائے جھونپڑی کی مٹی کی دیوار میں بھی مخدوش ہوگئی ہیں ان پر الگ سے مٹی چڑھا کر ٹھیک کرنا اس کے لئے ایک سر درد ہے ایک میل دور تالاب سے مٹی جھونپڑی تک لانا.... لیکن اسے مٹی تو ڈھونا ہی پڑے گی تبھی تو ان مٹی کی دیواروں پر نیا چھپر پڑے گا تو دو چار سال سکون سے کٹ جائیں گے اور ان برساتی بیماریوں سے بھی نجات مل جائے گی جو موت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور علاج ولاج کے لئے پیسے بھی تو بہت لگتے ہیں یہ ڈاکو نما ڈاکٹر بس قلم چلا دیتے ہیں انھیں کیا معلوم اس قلم کی روشنائی سے نکلنے والے حروف کی بھرپائی کے لئے مریض کے جیب میں مقدور بھر پیسہ ہیں کہ نہیں.....؟

چیئر مین صاحب کا جلوہ یوں تو پہلے سے ہی خوب تھا۔ لیکن چیئر مین بننے کے بعد خوب سے خوب تر ہو گیا پہلے تو ان کی زمینوں کے مزدور بٹائی دار وغیرہ حویلی آیا کرتے تھے لیکن اب ان سے ملنے شہر اور گاؤں دیہات کے ضرورت مند افراد کے آنے کا سلسلہ ہے۔ دس بجے سے ۱۱ر بجے تک وہ ضرورتمندوں و شکایت گذاروں سے ملاقات کرتے ہیں گیارہ سے بارہ بجے تک لنچ اور ۱۲ بجے کے بعد میونسپلٹی کے آفس میں جا کر بیٹھتے ہیں جہاں فائلوں کو دیکھنا ان پر اور اخراجات کے چیکوں پر دستخط کرنا نیز ممبران میونسپلٹی کے مسائل سننا بعدہٗ اپنی زمینوں کے چکر لگا کر پھر مدعوئین کی شادی بیاہ و دیگر تقاریب کی رونق بڑھانا۔ شکایت گزاروں میں کسی کے گھر کی پائپ لائن پڑنی کسی کی سڑک یا گلی میں انٹر لاک لگوانا..... پانی کانل، سوار لائٹس، لیٹرین بنوانا، اسٹریٹ لائٹیں لگوانا اور جہاں لگی ہیں ان کی درستگی کرنا کوئی ہاؤس ٹیکس پانی ٹیکس کے بلوں کو درست کرانے کے لئے درخواست گذار ہوتا اور کوئی بل کم کرانے کے لئے ضد کرتا ان

میں سے مسجدوں مدرسوں مندروں کے لئے چندہ وصول کرنے والے بھی ہوتے کچھ فلاحی واصلاحی وسماجی کاموں کو انجام دینے کے لئے مالی معاونت حاصل کرنے والے ہوتے الغرض ہر کسی کو کوئی نہ کوئی ضرورت انہیں یہاں لے آتی تھی۔

آج وہ دوسری بار چیئر مین صاحب کی حویلی غالباً ایک سال کے بعد آئی تھی لیکن اسے یہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آرہا تھا آج تو چیئر مین صاحب کے زمین کے مزدور بٹائی دار ٹھیکیدار ومصاحبین بھی دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے کیا ہو گیا لوگوں کو.....؟ کیا اب سب کی ضرورتیں شکایتیں رہی ہی نہیں سب کے سب مالا مال اور نہال ہو گئے اور ایک میں ہی مفلس و نادار بچی ہوں...خدا نہ کرے کیا چیئر مین صاحب...؟ اس کی بے چینی قدرے بڑھتی جارہی تھی گیارہ بجنے کو تھے اور کوئی نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی حویلی کی بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا دور دور تک سناٹا پسرا ہوا تھا جیسے قبرستان میں ہوتا ہے یا پھر کرفیو میں لیکن یہاں کرفیو تو لگ نہیں رہا لوگ باگ وگاڑیاں وغیرہ آجارہی ہیں جبکہ کرفیو میں تو کوئی گھر سے باہر بھی نہیں نکلتا اور نہ ہی یہ قبرستان ہے...؟ تنگ آکر اس نے حویلی کی بیٹھک کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا چار پانچ منٹ کے بعد ایک بوڑھے نے دروازکھولا اور بولا'' کا ہے در وجہ ٹھوک رہی ہو تم کا کونو کام کاج نا ہی ہے....''اس بوڑھی عورت نے سر جھکا کر بڑی نرمی و آہستگی سے کہا'' کا چیئر مین ساب ہیں؟ ہاں سور ہے ہیں اور اس نے زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے مزید کہا'' اب مل کے کا ہوگا ساب الیکشن ہار گئے ہیں وہ چیئر مین اب نا ہی رہین...

❑❑❑

مدہوشؔ بلگرامی
بہراسوداگر مشرقی، ہردوئی-Mob.9696778136

غزل

بھگو رہا ہے جو اشکوں سے رات کے گیسو
مہک رہے ہیں اسی کی حیات کے گیسو

جنہیں سجایا تھا ہم نے کتابِ ہستی میں
بکھر گئے ہیں وہی واقعات کے گیسو

نہ جانے ٹوٹ کے برسیں گے کس کے آنگن میں
یہ ابر ہائے کرم یہ حیات کے گیسو

کھلے ہیں جب سے یہ گلہائے آرزو دل میں
چمک رہے ہیں فضاؤں میں رات کے گیسو

جسے بھی ڈس لیں وہ پانی نہ عمر بھر مانگے
بڑے عجیب ہیں یہ سانحات کے گیسو

یہی تقاضا ہے ان کو سمیٹ لیں مدہوشؔ
جو منتشر ہیں حیات و ممات کے گیسو

●●●

ڈاکٹر زیبا ناز
لیکچرر گلاب سنگھ ہندو پی جی کالج چاندپور، مرادآباد
Mob.9634191717

ڈی پی

گاؤں میں ایک بہت عزت دار گھرانے کی بہو لیلا وتی کے کردار کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے کون تھا جو اسے نہیں جانتا تھا حالانکہ وہ بہت خوبصورت نہیں تھی لیکن اپنے خلوص، اخلاق، جذبات واحساسات، محنت ومشقت اور محبت واخوت کی وجہ سے ہر دل عزیز تھی۔ اس نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا وہ کشادہ ذہن تو تھی ہی علم وعمل سے بھی نزدیک تھی اسی وجہ سے اس کو سماج بہت پسند کیا کرتا تھا۔ شرافت، نجابت اور تہذیب نے اس کے کردار کو چار چاند لگا دیے تھے۔ شادی کے معاملات میں بھی اس نے کبھی دخل نہیں دیا جب کہ یہ زندگی کا سب سے اہم اور بڑا فیصلہ ہوتا ہے۔ شہر کی لڑکی گاؤں میں آکر خود کو اس ماحول میں ڈھال لے اور سسرال والوں کو اپنا گرویدہ بنالے یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس پر مختلف قسم کے حالات آتے جاتے رہے کبھی کبھی وہ خود کو بہت تنہا اور بے سہارا محسوس کرتی۔ لیکن اپنے حوصلہ اور اعتماد کو برقرار رکھتی وہ اپنے اندرون کو ٹوٹنے سے بچاتی اور قوت ارادی کو مزید استحکام بخشتی یہی نہیں اس نے بہت بڑے بڑے کام انجام دیے اور خود کو تکبر سے دور رکھتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔

لیلا وتی کی شادی کو بیس سال بیت گئے ان بیس برسوں میں اس نے پلنگ پر بیٹھ کر ایک دن نہ کھایا۔ آج بھی بدستور محنت ومشقت کے ساتھ پورا دن بسر کرتی ہے۔ اپنی لاڈلی کو پڑھاتی کیونکہ خود پڑھی لکھی تھی لاڈلی سے گھر کا کوئی کام نہیں کراتی جب کہ خود نوکری کرنے روزانہ شہر جاتی اور شام تک گھر واپس آجاتی یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

ایک دن لیلا وتی شہر جانے کے لیے بس اسٹینڈ پر کھڑی تھی تبھی اسے اسی کے گاؤں کی ایک عورت آتی ہوئی دکھائی دی وہ لیلا وتی کو دیکھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اس کے پاس آئی جیسے اسے لیلا وتی سے ہی کوئی کام ہو۔ لیلا وتی نے گھبرا کر اس کا حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس عورت کا بیٹا کہیں گیا ہوا تھا اور وہاں وہ چھت سے گر پڑا اس کی جان کے لالے ہیں لہٰذا وہ اپنے بچے کے پاس گھڑی کی چوتھائی میں پہنچنا چاہتی ہے لیلا وتی خود بہت دیر سے سواری کے

انتظار میں کھڑی تھی اس عورت کی مجبوری سن کر بے چین ہو اٹھی۔ دور دور تک سواری کا نام ونشان نہ تھا آناً فاناً اس نے سامنے سے آرہی ایک کار کو ہاتھ دے دیا ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ وہ بھلا شریف انسان معلوم ہوتا تھا لیلا وتی نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ شہر کی طرف ہی جارہا ہے لیلا وتی نے اس سے التجا کی کہ وہ ہمیں بھی اپنی گاڑی میں بٹھالے کیونکہ بس کا دور دور تک پتہ نہیں ہے اور ہمیں جلد ہی اس عورت کے بچے کے پاس جانا ہے ڈرائیور نے ان کو گاڑی میں بٹھالیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر لیلا وتی کی اس عورت سے باتیں ہوتی رہیں ڈرائیور گاڑی کے سامنے والے شیشے سے پیچھے بیٹھی ہوئی ان دونوں کو دیکھتا جاتا اور ان کی باتوں کو بغور سنتا رہا، جب وہ دیکھتا تو یہ دونوں چپ ہوجاتیں اور سوچنے لگتیں کہ یہ کوئی جان پہچان کا تو ہے نہیں لیکن یہ کون ہے؟ عورتوں کی منزل آگئی اور وہ ڈرائیور کا شکریہ ادا کرتی ہوئی گاڑی سے اتر گئیں۔

ایک دن اچانک لیلا وتی کے پاس اسی ڈرائیور کا فون آتا ہے لیلا وتی حیران رہ جاتی ہے کہ آخر اس کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟ فون پر ہائے ہیلو کے بعد رسمی سی بات ہوئی اور ختم ہوگئی۔ کچھ دن بعد وہ لیلا وتی کو راستے میں اسی جگہ مل جاتا ہے۔ ایک بار ساتھ ہوگیا اور فون پر بات ہوگئی اس لیے لیلا وتی کی بھی جھجک کسی قدر دور ہوچکی تھی اور جان پہچان بھی ہوگئی تھی۔ قدرے تکلف کے ساتھ لیلا وتی اس کے کہنے پر ساتھ سوار ہوگئی اب یہ مواقع اکثر نہیں بیشتر آتے رہے لیلا وتی اس کے ساتھ جانے میں خود کو محفوظ سمجھنے لگی دھیرے دھیرے جان پہچان گہری ہوتی گئی ڈرائیور بھی اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے لگا دونوں میں دوستی گہری ہوگئی جب دونوں مل کر جاتے تو فاصلے سمٹ کر مٹھی میں آجاتے گرم ہوائیں بھی نسیم صبح کا مزہ دیتیں۔ چلچلاتی دھوپ میں بھی دونوں کو آنند آتا یہ ساتھ اتنا دلکش اور پرسکون ہوتا کہ دونوں بیحد مسرور و دنیا و مافیہا سے بے خبر لیکن محتاط رہتے۔ ڈرائیور کم بولتا لیلا وتی زیادہ بولتی اور کوئی نہ کوئی گا تھا سناتی ہی رہتی کبھی کبھی گانے اور گنگنانے بھی لگتی مگر جب وہ بولتا تو ساکت وجامد ہمہ تن گوش ہوجاتی۔ وہ تھا تو ایک معمولی ڈرائیور لیکن بہت سنجیدہ اور دلچسپ تھا لیلا وتی کو اس کی صاف گوئی بھی بہت پسند تھی۔ کئی مرتبہ لیلا وتی نے اسے گھر آنے کی دعوت دی تو اس نے انکار کردیا۔

ایک روز لیلا وتی مقررہ وقت سے پہلے لوٹ کر گھر واپس آگئی تو کیا دیکھتی ہے کہ وہی ڈرائیور گھر کے اندر موجود ہے ڈرائیور کو گھر کے اندر دیکھ کر لیلا وتی کے ذہن و دل پر بجلی گر پڑی اس کا سر چکرانے لگا آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جب ہوش و حواس درست ہوئے تو سب سے پہلے اس نے اپنے فون کی ڈی پی سے لاڈلی کی فوٹو ہٹائی۔

❑❑❑

تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجنا لازمی ہے۔

تبصرہ

نام کتاب : انتظار حسین کی افسانہ نگاری

مصنف : ڈاکٹر ابرار احمد

صفحات : ۱۶۰

قیمت : ۲۰۰/- روپئے

سنہ اشاعت : ۲۰۲۰ء

مبصر : محمد خبیب

موبائل نمبر : 9616463883

اردو فکشن خاص طور سے افسانہ میں علامت نگاری کے حوالے سے انتظار حسین کا نام محتاج تعارف نہیں وہ ایک ایسے بلند پایہ کثیر الجہات فنکار تھے جن کی فکری وفنی بصیرت کا اعتراف ناقدین ادب نے بڑی کشادہ دلی سے کیا ہے۔

زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں ڈاکٹر ابرار احمد نے انتظار حسین کی افسانہ نگاری پر کافی مختصر مگر جامع اور مدلل انداز میں موضوع کا مکمل تعارف پیش کرنے کی کامیاب اور قابل تعریف کوشش کی ہے مصنف نے اپنی پہلی کتاب کا انتساب اپنے والدین کے نام کرکے ایک اہم ذمہ داری نبھائی ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

علمی وادبی دنیا میں ڈاکٹر ابرار احمد کا شمار نو واردین ادب میں ہوتا ہے موصوف کو اردو نثر میں ادب اطفال اور افسانہ نگاری سے دلچسپی ہے۔ ابتدائی وثانوی تعلیم کے بعد انہوں نے عصری اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے حاصل کی۔ آپ درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہیں اور فی الحال پونا کالج آف آرٹس سائنس اینڈ کامرس پونے میں ہیں اسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تدریسی خدمات بحسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔

تدریسی فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ ہی موصوف علمی وادبی اور تحقیقی وتصنیفی کاموں سے بھی وابستہ ہیں، آپ ایک ایسے نوجوان ادیب، افسانہ نگار اور فعال و متحرک قلم کار ہیں جن کے علمی وادبی اور تنقیدی وتحقیقی مضامین ومقالات مختلف علمی وتحقیقی رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب اردو فکشن سے ان کے والہانہ لگاؤ اور خصوصی دلچسپی کی ایک نمائندہ اور قابل تعریف مثال ہے جس میں مصنف نے انتظار حسین کی افسانہ نگاری پر غیر جانبداری سے موضوع کا بھرپور حق ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر ابرار احمد کی یہ کتاب ایک سو ساٹھ صفحات اور

چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے صرف سات صفحات میں انتظار حسین کے سوانحی کوائف کو جدید انداز میں پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے جو انتہائی مختصر ہونے کے باوجود بھی انتظار حسین کے فکر وفن کو سمجھنے کے لئے کافی جامع ہے۔اس باب میں مصنف نے انتظار حسین کی جملہ مطبوعات کا ایک اجمالی تعارف پیش کیا ہے جس میں ان کے گیارہ افسانوی مجموعے اور اس میں شامل افسانوں کے نام درج ہیں اس میں انتظار حسین کی جملہ ادبی خدمات کا مکمل تعارف پیش کیا گیا ہے۔

مصنف کا اسلوب تحریر رواں اور عام فہم ہے وہ علمی اور تحقیقی انداز میں بات کو بیان کرنے کا عمدہ سلیقہ رکھتے ہیں۔ مثلاً پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین وہ صاحب بصیرت اور عہد ساز فکشن نگار ہیں جن کی بدولت اردو فکشن کو ایک وقار اور متعین سمت ملی، اردو فکشن کا دامن وسیع اور گہرا ہوا۔ انہوں نے مشرقی ادبی روایات کی بازیافت کی، انہیں فکشن کی دنیا میں ایک خاص اہمیت ومقبولیت حاصل ہے، ان کے ناول اور افسانے اردو ہی میں نہیں بلکہ عالمی ادب میں بھی ایک امتیازی اور انفرادی مقام رکھتے ہیں"۔
> (انتظار حسین کی افسانہ نگاری صفحہ ۶)

کتاب کے دوسرے باب میں انتظار حسین اور ان کے عہد کی سیاسی وسماجی اور ادبی صورت حال کا تفصیلی تذکرہ ہے جس کے مطالعے سے ان کے عہد و ماحول کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ابرار احمد نے زیر نظر کتاب کے تیسرے باب میں انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا فکری وفنی تجزیہ پیش کیا ہے جس میں ان کے افسانوں کے اسلوب تحریر، زبان اور تکنیک سے بحث کی گئی ہے۔ مذکورہ کتاب کے چوتھے باب میں انتظار حسین کے افسانوں اساطیری اور دیو مالائی عناصر کا بیان ہے، یہ باب انتہائی اہمیت کا حامل ہے اس میں مصنف نے موضوع کا تعارف کافی جامع اور علمی انداز میں پیش کیا ہے اور انتظار حسین کے نمائندہ افسانوں کے حوالے سے اپنی بات کو دلیل کے ساتھ تحقیقی انداز میں قارئین کے سامنے رکھا ہے۔

انتظار حسین کی افسانہ نگاری کے حوالے سے مصنف کی یہ کتاب انتہائی مختصر ہونے کے باوجود بھی اپنے موضوع پر مستند ومعتبر ہے، موصوف نے اس کتاب کو لکھنے میں کافی محنت کی جس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ کتابیات کی فہرست میں بنیادی ماخذ انتظار حسین کی 21 کتابوں کا ذکر ہے جبکہ ثانوی ماخذ میں 87 کتابوں کے نام شامل ہیں۔اسی طرح دو درجن ادبی رسائل و جرائد کے نام کتابیات کی فہرست میں شامل ہیں۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر ابرار احمد کی یہ کتاب اہل علم حضرات کی خصوصی توجہ کی مستحق ہے اس اہم موضوع پر کتاب کی اشاعت کے لئے مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

❑❑❑

R. No. 25039/72
U.P. Urdu Akademi
Khabarnama
उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा
اُتر پردیش اُردو اکادمی خبر نامہ
Vol. No. 52 September 2023 Issue No. 3

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں /دارالمطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہنامہ ''خبر نامہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ اقلیتی طلباء کو ''سول سروسیز کی تیاری کے لئے اردو آئی-اے-ایس-اسٹڈی سینٹر'' اور ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر۔

یونیورسٹی سطح کی نصابی کتابیں

نمبرشمار	نام کتاب	مصنف	قیمت	نمبرشمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
1-	ادب پارے (نثر)	سید احتشام حسین	45/=	10-	انتخاب منظومات (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	55/=
2-	ادب پارے (نظم)	سید احتشام حسین	45/=	11-	'' نثر (حصہ اول)	مجلس مشاورت	62/=
3-	انارکلی	امتیاز علی تاج	43/=	12-	'' نثر (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	78/=
4-	انتخاب افسانہ	مجلس مشاورت	134/=	13-	بکٹ کہانی	نورالحسن ہاشمی	45/=
5-	'' خطوط غالب	مجلس مشاورت	28/=	14-	لازمی نصاب	حکم چند نیر	46/=
6-	'' غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	70/=	15-	معیاری نثر و نظم	حامد ندیم	73/=
7-	'' قصائد	مجلس مشاورت	64/=	16-	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	135/=
8-	'' مراثی	مجلس مشاورت	120/=	17-	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/=
9-	'' منظومات (حصہ اول)	مجلس مشاورت	54/=				

شخصیات سیریز

نمبرشمار	نام کتاب	مرتب	قیمت	نمبرشمار	نام کتاب	مرتب	قیمت
1-	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	438/=	10-	سالک لکھنوی	پروفیسر مظفر حنفی	216/=
2-	ندا فاضلی	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=	11-	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر ذکی طارق	216/=
3-	کلیم عاجز	// مناظر عاشق ہرگانوی	288/=	12-	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر توقیر احمد خاں	245/=
4-	زبیر رضوی	ڈاکٹر مہتاب امروہوی	262/=	13-	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/=
5-	نشتر خانقاہی	اسد رضا	260/=	14-	حفیظ میرٹھی	ڈاکٹر تابش مہدی	245/=
6-	ساغر خیامی	ناشر نقوی	215/=	15-	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/=
7-	مظہر امام	امام اعظم	208/=	16-	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/=
8-	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	233/=	17-	معراج فیض آبادی	ڈاکٹر کلیم قیصر	245/=
9-	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/=				

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں
سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010
سیلس ڈپو-موبائل نمبر 7081007078
Website:www.upurduakdemi.org E-mail:upurduakademi3@gmail.com